قومی زبان

اقبال

خصوصی شمارہ، قیمت: ۱۲ روپے

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان نومبر ۱۹۹۹ء، جلد: ۱۷ شمارہ: ۱۱

بیادِ اقبال

خصوصی شمارہ، قیمت ۱۲۰ روپے

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۲۲۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

ن: ۰۶ ۴۶۱۴-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

مجدد الف ثانیؒ۔ اقبال اور تصوف	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۵
اقبال کے ساتھ ایک شام کی یادیں	این اسٹیفن امحسن احسان	۱۱
السانم آرزوست	پروفیسر شاہدہ یوسف	۱۵
لطف تغزل در شعر اقبال	نوید احمد گل	۲۶
اقبال شناسی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین	پروفیسر شفیق عجمی	۳۹
علامہ اقبال اور سر راس مسعود	پروفیسر فتح خاں ملک	۴۲
اقبال غزل خواں ہو	ڈاکٹر محمد رضا کاظمی	۵۰
علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات	پروفیسر انجم بانو کاظمی	۵۵
چین میں اسلامی خطی نسخوں کا سروے	تنگ ھوی جو/ڈاکٹر محمد اقبال شاہد	۶۵
جدیدیت اور مابعد جدیدیت	پروفیسر نظیر صدیقی	۷۵
جمیل الدین عالی کی انجمن ترقی اُردو...	ادیب سہیل	۷۹
رفتارِ ادب	-	۸۸
گردوپیش	-	۹۴
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۱۰۲

ماہنامہ قومی زبان سال بھر میں دو بار علامہ اقبالؒ کی یاد میں گوشے مرتب کرتا ہے۔ ایک نومبر اور دوسرا اپریل کے مہینے میں۔ نومبر کے مہینے میں اُن کی پیدائش اور اپریل کے مہینے میں اُن کی وفات کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اقبالؒ پر یہ گوشہ پھیل کر پورے پرچے کو محیط ہوجاتا ہے اور کبھی اِس کی مقررہ ضخامت اپنی حد پھلانگ جاتی ہے اور یہ طریقۂ ترتیب ہماری پچاس سالہ روایت کا حصہ بن گیا ہے۔

اِن مواقع پر ساری دنیا میں علامہ اقبالؒ کی یادیں، "بہ ہر رنگ" منائی جاتی ہیں۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ان کے فن و شخصیت پر مشاہیرِ علم و ادب سے مقالے پڑھوائے جاتے ہیں، اخبارات و جرائد خصوصی نمبر نکالتے ہیں اور ادبی اداروں کی طرف سے علامہ پر کتب کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

پچاس برسوں میں وقت کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی مقبولیت و پذیرائی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ وہ اُردو دنیا سے نکل کر فارسی دُنیا میں بھی محبوب و مقبول ہوچکے ہیں اور اب ان کا کلام زبان زدِ خلائق ہے۔

علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ نے فارسی دُنیا کو بالآخر زبان دانی کے اُس غرّہ اور تخصیص پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور کردیا جسے ایران کے قدیم زبان دانوں نے روا رکھا تھا اور جس کے تحت ہندوستان کا صرف ایک شاعر امیر خسرو اُن کے حیطۂ معیار و پسندیدگی پر پورا اُترا تھا۔ اُن کی اِس پسندیدگی کا انحصار بیشتر کلام کی ظاہری ساخت و تجسیم پر تھا۔ ظاہری محاسن کی چکاچوند میں کلام کی روح یا داخلی محاسن نظر سے اوجھل رہے۔ اُنھوں نے بیدل و غالب کو بھی بمشکل قابل توجہ سمجھا (البتہ بیدل تاجکستان میں بڑے مقام پر فائز ہیں۔)

فارسی دنیا کی وہ نئی نسل جو بیسویں صدی کے نصف کے بعد علم کی ہمہ جہت سطوح سے آراستہ ہوئی اور اس نے کنویں سے باہر نکل کر دیکھنے کا وتیرہ اپنایا تو ہم دیکھتے ہیں کہ پاک و ہند کے نامور فارسی شعرا کی بازیافت زیادہ سے زیادہ ہورہی ہے۔ بیدل، غالب اور اقبال از سرِ نو ان کے دائرۂ پذیرائی میں آئے ہیں۔ نئی نسل کے فارسی ناقدین خود کو کلام کی محض ظاہری ساخت و تجسیم تک محدود نہیں رکھتے، وہ دروں بینی کے ہنر سے آراستہ ہیں اور کلام کی روح تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ گزشتہ مہینوں میں فارسی ناقدین کے کئی اسی نوع کے مضامین خود قومی زبان میں شائع ہوئے ہیں جو بیدل، غالب اور اقبال سے متعلق ہیں۔

قومی زبان کو جب بھی اُردو ترجمے کی شکل میں ایسے مضامین حاصل ہوئے وہ اپنے قارئین کے لیے پیش کرے گا۔ کیونکہ فارسی کے جدید ناقدین و محققین کی آرا ان شعرا کے سلسلے میں یقینی تازہ ہوا کے مترادف ہوں گی۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت	صفحات
(۱) نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	۲۰۰/-	۴۰۰
(۲) غالب کا سائنسی شعور	ڈاکٹر سید حامد علی شاہ	۷۵/-	۱۵۲
(۳) انتخاب کلامِ ناسخ	رشید حسن خاں	۱۲۰/-	۳۳۰
(۴) ہماری زبان، مباحث و مسائل	پروفیسر طاہر فاروقی	۷۵/-	۱۶۰
(۵) اقبال اور ان کا پیغام	پروفیسر رالف رسل	۱۰/-	۲۴
(۶) غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-	۳۸۳
(۷) رباعیاتِ عجائبات	امّو جان ولی دہلوی	۵۰/-	۸۰
(۸) اقوال و امثال	سید یوسف بخاری	۴۵۰/-	۱۰۰۸
(۹) جدید اُردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	۱۷۵/-	۴۶۴
(۱۰) زبانِ واحد	میرین مولٹینو اصفیہ صدیقی	۱۰۰/-	۱۸۴
(۱۱) مشاہیر یونان و روما (حصہ پنجم)	پلوٹارک/سید ہاشمی فرید آبادی	۱۱۰/-	۲۷۰
(۱۲) اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۵۰/-	۴۴۸
(۱۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر	شفیع عقیل	۹۰/-	۳۱۲
(۱۴) عالمی ادب سے خوبصورت نظموں کے ترجمے	ضمیر احمد	۱۵۰/-	۲۳۰
(۱۵) اُردو پاکستان کی قومی زبان	میاں بشیر احمد	۵۰/-	۹۶
(۱۶) مطالعۂ عبدالحق	سید قدرت نقوی	۱۰۰/-	۱۷۶
(۱۷) آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۵۰/-	۲۸۸
(۱۸) سعید کی پراسرار زندگی	انتظار حسین	۱۲۰/-	۲۲۹
(۱۹) اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۵۰/-	۵۴۴
(۲۰) سر سید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اُردو مولوی عبدالحق	۷۵/-	۱۶۰
(۲۱) خطوطِ عبدالحق بنام آل احمد سرور	پروفیسر آل احمد سرور	۶۰/-	۱۰۴

مجدّد الف ثانیؒ اقبال اور تصوف

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

"حضرت مجدد الف ثانی اور آج کے چیلنج" کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں مجھے بہ حیثیت مقرر دعوت شرکت ملی تو مجھے یک گونہ تعجب ہوا۔ میں مذہبی عالم صوفی ہونے کا دعویٰ کرنے کا بھی اہل نہیں ہوں۔ البتہ برصغیر کی ادبی اور ثقافتی تاریخ سے مجھے طالب علمانہ تعلق ضرور ہے اور یہ تعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات کے اثرات سے مجھے لاتعلق نہیں رکھ سکتا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی فکر کے اثرات نے تمام اسلامی فرقوں کے سوچنے والے اذہان، حتیٰ کہ برصغیر کے دیگر مذاہب، ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور سکھ مت کے دانشوروں تک کو متاثر کیا ہے۔ پھر جب اس سیمینار کے موضوع پر غور کیا تو میں متفق ہوا کہ خواہ آپ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی خواہ آپ باطن ہوں یا ظاہر پرست، روائتی فکر کے حامل ہوں یا جدید فکر کے ترقی پسندانہ، لبرل، جمہوری یا آمرانہ رویوں میں سے کسی ایک رویہ کو اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہوں آپ کو ہر صورت میں جس بزرگ سے کوئی نہ کوئی زاویہ اتفاق یا اختلاف بنانا ضروری ہو جاتا ہے وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذات ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ سوچنے والا ذہن رکھنے کے دعوے دار ہوں اور آپ مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں غیر جانبدار رہ سکیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ وہ بزرگ ہیں جنھیں اپنے سلسلہ تصوف میں شامل کرنے کے لیے ان کے پیر خواجہ باقی باللہؒ بنفسِ نفیس ہندوستان تشریف لائے تھے اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ خود خواجہ باقی باللہؒ اپنے مرید کے سامنے برائے استفادہ تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ اور خود انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ شیخ احمدؒ یعنی مجدد الف ثانیؒ کے فیض کی بدولت "وحدت الوجود کے جال" سے باہر نکل سکے ہیں۔

(زبدۃ المقامات، ۱۳۱۰ھ، ص ۱۵۵)

حضرت مجدد الف ثانیؒ برصغیر میں، وحدت الشہود کے سب سے بڑے طاقتور اور مؤثر وکیل تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُن کے لیے مجدد الف ثانی کے لقب کو سب سے پہلے جس بزرگ نے استعمال کیا وہ سیالکوٹ کے ملا عبدالحکیم (وفات ۱۰۶۷ھ) تھے جو ہندوستان کے شیخ الاسلام کے منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی آپ کو اسلامی ہجری کیلنڈر کے دوسرے ہزار سال کے لیے مجدد الف ثانیؒ کے خطاب سے یاد کیا۔ اس وقت تک ہر صدی کا ایک مجدد ہوتا چلا آیا تھا۔ یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (D 101 AH) سے شروع ہوتا ہے اور نویں صدی ہجری کے جلال الدین سیوطی (A-911) تک چلتا ہے۔ اس میں امام شافعی، امام باقلانی، امام غزالی، امام رازی، ابن دقیق، امام بلقینی جیسے بزرگ شامل ہیں۔ خود حضرت مجدد الف ثانیؒ اس یقین سے سرشار تھے کہ وہ دو احادیث کی رو سے (جو "جمع الجوامع" اور "جامع الدرد" میں موجود ہیں) مجددِ عصر ہیں۔

مناسب ہو گا اگر میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تصورات پر مختصر وضاحت پیش کروں میرے خیال میں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان دونوں اصطلاحوں کا کوئی وجود نہیں تھا اور صرف وحدانیت پر زور دیا جاتا تھا۔ نظریہ وحدت الوجود کی رو سے وجود صرف ایک ہے اور وہ ذات خداوندی ہے کائنات کی تمام اشیا اس کی صفات کے مختلف مظاہر اور شیون ہیں ہمہ وقت وہ ذات اپنی شانوں کی طرح طرح سے اظہار کرتی رہتی ہے۔ اور نظریہ کے بموجب ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں اور ان میں کوئی دوئی کا شائبہ نہیں۔

وحدت الشہود کا نظریہ دراصل وحدت الوجود کے ردِ عمل کے طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ ایک صوفی کے مطابق "ذاتِ خداوندی اور اشیا کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بلکہ غیر ہیں۔ خدا کی ذات ہماری عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہے کائنات خدا کی ذات یا صفات کا مظاہر نہیں بلکہ موجود بالذات ہیں۔" وحدت الشہود کے نظریہ کی رو سے اگر سالک کو حالت جذب میں خدا اور کائنات کے درمیان عینیت کا تعلق نظر آتا ہے تو وہ حقیقی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتا ہے۔ جب سالک راہ از دیار محبت سے سرشار ہو کر ماسوا سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور صرف خدا ہی کے تصور کو اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے تو اس کو ذاتِ خداوندی کے سامنے اپنی ذات اور کل کائنات معدوم نظر آنے لگتی ہے اور وہ اس کی کیفیت میں کبھی "اناالحق" سمجھ اُٹھتا ہے اور کبھی "سبحانک شانی" در حقیقت کیفیت اپنے جذبہ اور مشہود کی کارفرمائی ہے اور واقعیت اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ان ہر دو مکاتبِ فکر کے بارے میں مندرجہ بالا توضیحات کے بعد یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ جیسے عالم اور مفکر نے مجدد الف ثانیؒ سے وحدت الوجود کے مسئلہ پر اس درجہ اختلاف کیا کہ اس نظریہ کی حمایت کر ڈالی اور اسے اہلِ حق کا مسلک قرار دے دیا انھوں نے اپنے رسالہ فیصلہ وحدت الوجود والشہود (1143 A.H) میں فرمایا ہے کہ وحدت الوجود کے بارے میں ان کے اور وحدت الشہود کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریات میں چنداں فرق نہیں ہے بلکہ یہ دونوں نظریات اصل میں ایک ہیں۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جس پر کافی لے دے ہوئی ہے اس فیصلہ پر مولانا غلام یحییٰ صاحب نے اپنی کتاب کلمۃ الحق (۱۱۸۴ ہجری) میں شاہ ولی اللہ پر سخت تنقید کی ہے یہ کتاب حضرت مظہر جانِ جاناں (جو اُردو کے مشہور شاعر ہیں اور جنھیں فرقہ وارانہ اختلاف کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا) کے ایما پر لکھی گئی۔ مولانا غلام یحییٰ کی تنقید میں شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے دمغ الباطل اسی سال (۱۱۸۴ ہجری) میں تحریر کی۔ جس میں شاہ ولی اللہی سلسلہ کی طرف سے ایک بار پھر دعویٰ کیا گیا کہ وحدت الوجود صحیح نظریہ ہے اور یہ اسلام کا سچ ہے انھوں نے اپنے والد کے شاگرد شاہ شرف الدین کی "فصوص الحکم" پر تشریح کی بنیاد پر یہ خیال پیش کیا۔ اب میں اس نزاع کے اصل کی طرف آتا ہوں۔ حضرت محی الدین عربیؒ کا دعویٰ ہے کہ (۱) اللہ کی ذات اس کی صفات کا عین ہیں غیر نہیں (۲) دنیا اس ذاتِ واحد کی صفات کی تجلی ہے اور (۳) ذات اور صفات کے مابین دوئی مٹ چکی ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست ہے۔ کہ وحدت الوجود کا نظریہ مولانا رومیؒ، صدرالدین قونویؒ، فخرالدین عراقیؒ، احدالدین کرمانیؒ، مولانا جامی اور محب اللہ الہ آبادی تک آتے آتے کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عہد میں جس طرح وحدت الوجود کے نظریہ کی تاویل کی جا رہی تھی اس میں نظریہ حلول تک شامل ہو گیا تھا۔ یہ سمجھا گیا کہ اسلامی سماج کے سیاسی قویٰ کی حد درجہ کمزوری اور اضمحلال اسی سبب سے تھا۔ واقعتاً اسلامی سماج میں زندگی کے آثار ہی ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ اٹھارویں صدی میں مرزا درگاہ قلی کی تصنیف "مرقع دہلی" کے مطالعہ سے برِصغیر میں اسلامی سماج کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ صرف افسوس ناک ہی نہیں بلکہ ہولناک بھی ہے۔ مزارات پر رقاصاؤں کے عریاں دھمال، منشیات کا آزادانہ استعمال، الوہیت میں صاحبان مزار کو شریک سمجھنے کا عقیدہ، علم بیزاری، عقل دشمنی، اور مقدر پرستی کی روش نے شمالی ہند کے مسلم برِصغیر کو اس درجہ سیاسی اور فکری طور پر کمزور کر دیا

تھا کہ یہ سماج انگریزوں کو ترغیب حکمرانی نہ دیتا تو اور کیا کرتا۔ بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور ۱۸۵۷ء میں علامتی بادشاہت کے خاتمے میں سو سال کا عرصہ کیوں لگا؟ اودھ انگریزوں کا حلیف تھا اور مرہٹوں کا خاتمہ محض رسمی کارروائی تھی۔ البتہ صرف ایک ٹیپو سلطان کی ذات تھی جس سے خطرہ تھا اور ٹیپو سلطان کی حکومت اور اس کا سماج "مرقع دہلی" میں پیش کردہ سماج سے یکسر مختلف تھا۔ اس سماج میں اپنے حکمراں کی طرح گیدڑ کی طرح نہیں بلکہ شیر کی طرح زندگی گزارنے کا حوصلہ موجود تھا۔ جہاز سازی کے کارخانے تھے۔ توپیں اور بندوقیں بن رہی تھیں۔ فرانسیسی طرز پر فوج کی تربیت ہو رہی تھی کسانوں کو زمین پر ملکیت کا حق دے دیا گیا تھا اور قانون کی حکمرانی کے نظریہ پر عمل ہو رہا تھا۔ ٹیپو سلطان نے جنوبی ہند میں اپنے فوجیوں کے لیے اردو کی اہمیت کا اندازہ لگایا اور اُردو کا ایک ہفت روزہ جریدہ شائع کرنا بھی شروع کیا جبکہ مغلوں نے اپنے دور میں اردو کی سرکاری طور پر سرپرستی نہیں کی۔ ٹیپو سلطان کے کردار پر خود انگریز جنرل حیران تھا کہ آخر عزیمت اور قربانی کے جذبہ سے سرشار یہ کون ہے جو ہمیں شکست پہ شکست دے رہا ہے۔ لندن میں ٹیپو کی بہادری سے متاثر ہو کر ڈرامے تک لکھے گئے۔ فرانسیسی ادیبوں نے ٹیپو کو خراجِ عقیدت پیش کرنا شروع کر دیا اور یہ سب اس لیے کہ دنیا بہادروں کا ساتھ دیتی ہے اور آج یورپ اگر برصغیر کے کسی حکمران کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ صرف ٹیپو سلطان ہے۔

آخر وہ کیا اسباب تھے کہ ٹیپو سلطان اٹھارویں صدی کے آخری عشروں میں ایک زیادہ خود آگاہ اور روشن خیال حکمراں ثابت ہوا جبکہ اس کے ہم عصر شاہ عالم ثانی نے خود کو کبھی انگریزوں اور کبھی مرہٹوں کا شاہ شطرنج بننے پر مجبور پایا۔ آپ اسے نادر شاہ درانی اور ابدالی کے حملوں کے بعد مغل سلطنت کے صوبے داروں کے پے در پے اعلانات خود مختاری پر محمول کر سکتے ہیں۔ جس نے شاہ عالم کو انگریزوں اور مرہٹوں کا Captive بنا کر رکھ دیا شاہ ولی اللہ جو سیاسی میدان میں مجدد الف ثانی ہی کے مکتب نظر کی توسیع ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اسلامی ہند کے زوال کی روک تھام کے لیے ایک خط میں پانچ تکاتی اصلاحی پروگرام پر زور دیتے ہوئے کہا کہ پانچ طرح کے لوگوں سے بچا جائے۔

(۱) بے حیا صوفی جو رفع تکلیف کے لیے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔
(۲) جھگڑالو معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے اور خدا کا عنقادو مطیع نہیں ہوتا۔
(۳) شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے...
(۴) خشک زاہد، جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں اجازت ہی حاصل نہیں۔
(۵) سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا ہے اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو درست رکھتا ہے۔

(دود کوثر، ص ۵۷۴، ۱۹۸۷ء)

پانچویں نکتہ میں عجمیوں کی ہیت کے بارے میں جو اشارہ ہے اسے ترک اور ایرانی امرا کی باہمی چپقلش کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ عجمی امرا لہو و لہب میں زیادہ گرفتار ہیں اور وہ شعائر اسلامی سے ترک امرا کے مقابلہ میں زیادہ دور ہیں۔ مندرجہ بالا نکتہ اس لیے بھی کہ جس نظریہ وحدت الوجود کو انھوں نے عین اسلامی قرار دیا تھا وہ عجمیوں میں زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ لیکن اس کے باوجود شاہ ولی اللہؒ نے فکری سطح پر وحدت الوجود کا اثبات ضروری سمجھا لیکن حد سے بڑھی ہوئی اباحیت، رقص و سرود اور عیش کوشی نے مسلم سماج کے قویٰ اس درجہ مضمحل کر دیے تھے کہ اقبال نے جس بنیاد پر مولویہ سلسلہ صوفیا کی رقص و سرود کی محفلوں کی دنیا سے بیزاری کی مخالفت کی وہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی رائے سے کامل اتفاق کا نتیجہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کو جس

روش پر اعتراض ہے کیا وہ طرزِ زندگی کسی جدید انقلابی گروہ کے لیے مناسب ہو سکتی ہے۔ کیا ایران کی موجودہ حکومت اٹھارویں صدی کے عجمی امرا یا کسی اور علاقے کے امرا کا دفاع کر سکی ہے مجھے تو اس طرزِ زندگی کے باب میں شاہ ولی اللہؒ اور امام خمینی کی تعلیمات میں چنداں فرق نظر نہیں آتا۔ شاید وحدت الوجودی مکتبِ فکر کی اس غرض سے پشت پناہی کی کہ شمالی ہند میں اسلامی تشخص کے اس مکتب سے بھی امتدادِ زمانہ کے ساتھ مفید مطلب کام لیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اٹھارویں صدی میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں نے جن میں شاہ عبدالہادیؒ اور شاہ فخرالدین پیش پیش رہے اسلامی تشخص کے لیے بنیادی کام کیا شاید اسی لیے اکابرِ دیوبند کی اکثریت تصوف میں چشتیہ، صابریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی معرکہ شاملی سے لے کر تحریک ریشمی رومال تک انگریزی سامراج کے خلاف خفی اور کبھی جلی انداز میں سینہ سپر رہی۔

مجدد الف ثانیؒ نے خدا کے ماسوا ہر غیر حق سے بے خوفی کے جذبہ سے سرشار ہونے پر زور دیا تھا۔ اور یہ بذاتِ خود اس امر کا اعتراف ہے کہ مجدد الف ثانیؒ کے دور میں مسلم سماج پر خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ یہ معاشرہ محاصرہ جیسی نفسی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور حقیقت پسندی کے جذبہ کے ساتھ حقائق سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اس سماج نے اپنے لیے فراریت کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ مولویہ سلسلے کا رقص و سرود بھی مولانا رومی کی فکر کے برعکس رویہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومیؒ کو اپنا رہبر مانتے ہوئے بھی اقبال مولویہ سلسلہ کے درویشوں کی محافل رقص و سرود کے خلاف تھے اور اسے مولانا رومیؒ کی تعلیمات کے برعکس خیال کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا رویہ تھا جس نے مسلم ہندوستان ہی کیا عثمانی دور کے ترکی سے بھی مردوں کی طرح زندہ رہنے کا حوصلہ چھین لیا تھا، محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں شدت کی ایک وجہ ترک اشرافیہ کے زیرِ سایہ لہو و لعب کا رجحان بھی تھا، علامہ اقبال نے صلیبی جنگوں اور تاتاریوں کے حملہ کے بعد عالمِ اسلام پر چھائی ہوئی یاس اور مردنی کے اثرات کا مطالعہ کیا جو مسلمانوں کے زوال پر منتج ہوا۔ اس لیے انھوں نے مولانا رومیؒ کی پاپولر تشریح یکسر بدل کر رکھ دی اور بقول ڈاکٹر ظہیر الدین جامی فلسفہ مولانا روم کا دوسرا رُخ پیش کیا۔

عطا کن شور رومی سوز خسرو
عطا کن صدق و اخلاق سنائی
چناں بابندگی در ساختم من
نگرم گر مرا بخشی خدائی

اور اردو میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:

ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بےزار کرے

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رُخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اصل میں اقبال نے فرقۂ مولویہ کے مشاغل اور رقص و سرود کے اثرات کو دیکھا تو انھیں سعدی کے درج ذیل شعر کا ظہور سمجھ میں آیا۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ فال

کہ من از خدا پیش بودم دو سال

ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی کے مطابق الہیات اور تصوف کے ان دور از کار مباحث و اندیشہ ہائے افلاکی میں گرفتار ملت کے نام نہاد رہنماؤں کے ان مشاغل رقص و سرود نے زندگی کے ہنگاموں کو سہل اور آسان بنانے میں بڑا کردار ادا کیا تھا اور ترکی کو یورپ کا مرد بیمار بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس رہبانی تصوف کی فصل تھی جس کی مخالفت مجدد الف ثانیؒ نے کی تھی۔

غالباً اقبال نے نکلسن کے نام اپنے مکتوب میں "اسرارِ خودی" کی فلسفیانہ بنیاد کی وضاحت اسی نکتہ کی صراحت کے لیے کی تھی:

> Obviously the View of man and universe is opposed to that of the English neo. Hegelians as well as to all forms of pantheistic sufism which regards absorption in a universal life or soul as the final aim and salvation of man. the moral and religious ideology of man is not self negation but self affirmation.

یہ مقصد ذات اور صفات کے عین ہونے سے نہیں بلکہ غیر ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ سے علامہ اقبال کی عقیدت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اقبال جس تصوف کے خلاف تھے اس کی ترجمانی درجِ ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے:

گو سفندے در لباسِ آدم است

حکم او برجانِ صوفی محکم است

فکرِ افلاطون زیاں راسود گفت

حکمت او بود را، نابود گفت

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت

خالقِ اعیان نامشہود گشت

اور شاید اسی لیے اقبال نے وحدت الوجود کو مسلمانوں کے سیاسی زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

مجدد الف ثانیؒ اور اقبالؒ کی فکر قطعی طور پر یکساں نہیں ہے۔ اقبال جدید علوم کی روشنی میں علم الکلام میں پیہم تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ جبکہ مجدد الف ثانیؒ مسلمانوں کے اصحلال کی تمامتر ذمے داری ایمان میں کمزوری اور مسلمانوں میں عبدیت کے فقدان کو سمجھتے ہیں۔ اقبال ایمان کی ضرورت کے ساتھ جدید علوم پر کامل دسترس بھی چاہتے ہیں اور ان علوم کو معاشی سیاسی، ترقی کے لیے زینہ بنانا چاہتے ہیں۔ کہ یہی سرچشمۂ قوت و حیات تک رسائی کا ذریعہ ہے، ان کے خیال میں آج ہمارا سماج جس دوراہے پر کھڑا ہے وہاں "ہنگامہ موجود" میں بھرپور حصہ لینے کی ضرورت ہے اور قوت و حیات کے سرچشمہ سے فیض اُٹھا سکنے کے لیے اس ربودگی کی ضرورت ہے جس کے بل پر ہی قوت و حیات تک رسائی ممکن ہے ورنہ وہ رہبانیت کے حامی صوفیوں کے بارے میں یہ کیوں کہتے:

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت

خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

اقبال کے لیے "اعیانِ نامشہود" کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا کارِ لایعنی کے سوا کچھ اور نہیں اور شاید اسی لیے وہ "ہنگامۂ موجود" میں مقدور بھر شرکت اقتضائے حیات سمجھتے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں آج کا انقلابی، شیخ مجدد الف ثانیؒ اور اقبال بیک زبان ہنگامہ موجود میں شرکت اور جہدِ مسلسل کی دعوت دیتے ہیں۔

قدیم شعرا، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف

غزل نما

جس کو محترمہ ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور مطالعے کے بعد ترتیب دیا
طلبہ اور ریسرچ اسکالر دونوں اس سے مستفید ہوسکتے ہیں

صفحات: ۴۵۰

قیمت=/۱۰۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اُردو تنقید کا ارتقا

چوتھا ایڈیشن

ڈاکٹر عبادت بریلوی

صفحات: ۴۵۰

قیمت=/۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال کے ساتھ ایک شام کی یادیں

تحریر: این اسٹیفن*
مترجم: محسن احسان

[Ian Stephens قیام پاکستان سے قبل نئی دہلی سے شائع ہونے والے اخبار Statesman کے مدیر تھے۔ پاکستان کے بارے میں ان کی دو تصنیفات "پاکستان اور Horned Moon بہت مقبول ہوئیں۔ انھیں "اسٹیٹس مین" کے ادارت سے اس لیے مستعفی ہونا پڑا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کو کشمیر کے بارے میں Stephens کے نظریات سے اتفاق نہیں تھا۔ اس مضمون میں Stephens نے اقبال کے ساتھ کھانے کی میز پر گزاری ہوئی ایک شام کی یادیں جمع کی ہیں شام کا آغاز کچھ زیادہ "خوشگوار" نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اقبال اور صاحبِ مضمون کو ایک موضوع گفتگو مل گیا اور وہ تھا ـــــ کیمبرج]

میں اب کافی ضعیف ہو چکا ہوں برِصغیر کی بعض بڑی اہم اور تاریخی شخصیتوں سے جن کی اب پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے بارہا مل چکا ہوں گزشتہ برس پہلے لندن اور پھر اسلام آباد میں مسٹر جناح کے بارے میں اپنی یاد بیان کرنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مسٹر جناح سے کئی بار ملا اور میری یہ ملاقاتیں ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک یعنی ان کی موت سے چند ماہ قبل کے عرصے کو محیط ہیں۔ لیکن اس قسم کا کوئی بڑا دعویٰ میں اقبال کے سلسلے میں نہیں کر سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان یادوں کو قلمبند کرنے سے پہلے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ میری ان سے ایک ہی ضمنی سی ملاقات ہے۔

برِصغیر اور کیمبرج میں اقبال کی صد سالہ تقریبات کا اہتمام اس برس کیا جا رہا ہے۔ کیمبرج جہاں اقبال نے بہت عرصہ پہلے فلسفے کی تعلیم مکمل کی اور جہاں اب میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوں۔

مجھے اقبال سے صرف ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا اور جن باتوں کا میں تذکرہ کروں گا وہ دہلی کی صرف ایک شام کی یادوں پر مشتمل ہیں اگرچہ مجھے صحیح طور پر تاریخ یاد نہیں لیکن حافظے پر زور دینے سے اتنا دھیان پڑتا ہے کہ یہ نومبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔

میرے ذہن میں ان کی ظاہری شخصیت کے ایسے خدوخال نمایاں نہیں ہیں جیسے مسٹر جناح کے ہیں جن کے بارے میں، میں نے اپنے تاثرات گزشتہ برس ان کی صد سالہ تقریبات میں بیان کیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح غیر معمولی انسان تھے جسمانی

---

*مصنف کا انتقال ۱۹۸۰ کے عشرے میں ہوا۔

کشش کے اعتبار سے بھی اور سیاسی بصیرت کے طور پر بھی۔ یا پھر زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ آئینِ جہانداری یا فنِ ملک داری میں مہارت طویل رکھتے تھے۔ اس کے برعکس شاعر اور فلسفی اقبال نے آئین ملک داری کو متاثر کیا۔ مجھے ان کی معمولی شکل و صورت یاد ہے۔ آپ پہلی ملاقات میں ان کو دوسری دفعہ دیکھنے کی ہوس نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس مسٹر جناح پہلی ملاقات ہی میں چونکا دیتے تھے۔ اقبال نہ تو خاص دبلے تھے اور نہ ہی طویل القامت ان کے بال سفیدی مائل تھے۔ مونچھیں نیچے کی جانب گرتی ہوئی تھیں اور ان کی شخصیت میں ان سب چیزوں کی کمی تھی جو مسٹر جناح کی شخصیت میں بدرجہ اتم تھیں۔ اور ایک نظر دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھیں۔ حقیقتاً اقبال کی ظاہری شخصیت میں کوئی ایسی پر کشش بات نہیں تھی۔ سوائے اس دلکش مسکراہٹ کے جو خوشی کے لمحوں میں ان کے ہونٹوں پر پھیل جاتی بظاہر وہ بڑے محتاط اور کم آمیز تھے۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں برِ صغیر میں میری آمد اس وقت ہوئی جب میری عمر ستائیں برس تھی۔ میں بالکل پختہ اور ناتجربہ کار تھا۔ میں نے اپنے اندر اسلام کے لیے ہمدردی کا جذبہ محسوس کیا۔ میں نے سولہ برس کی عمر ہی سے عیسائیت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اگرچہ میں بنیادی طور پر مذہبی انسان ہوں۔ اور اگر ایک آدھ نسل پہلے پیدا ہو گیا ہوتا تو شاید میں کلیسا کے پادری کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوتا۔ میں نے اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے اس مذہبی تصور سے ہمیشہ نفرت محسوس کی کہ خدا کا پیدا کیا ہوا ایک بیٹا بھی ہے۔ نصرانی تصور کائنات اور ڈارون کے نظریہ ارتقا کے درمیان میں نے ہمیشہ بہت پیش پا افتادہ تضاد محسوس کیا یہ غیر نصرانی رویہ میں نے ایک نئے انسان کی طرح اپنے اندر محسوس کیا۔ اس کے علاہ ہندوستان کے فنِ تعمیر کو دیکھ کر میں نے ایک قلبی مسرت حاصل کی۔ اور یہی مسرت مجھے دہلی کی تاریخی عمارات میں کھینچ کر لے گئی۔ میں اکثر اوقات پرانے قلعے کی اس خوبصورت مسجد میں شام کو جاتا جہاں ارد گرد کا ماحول میری روحانی تسکین کا باعث بنتا۔ کشادہ مناظر، مکمل سکوت اور پھر عبادت کے لیے سریلی اذان مجھے مسحور کر دیتی۔ میں اکثر اوقات قریب ہی حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی طرف نکل جاتا۔ میری خوش نصیبی کہ ایک مرتبہ خانقاہ کے موروثی محافظ حضرت خواجہ حسن نظامی سے میری ملاقات وہاں ہو گئی۔ ان کی یہ بڑی خوشگوار عادت تھی کہ وہ ولی کی سردیوں میں اپنے احباب کو اکثر مشاعرے کے لیے مدعو کرتے۔ کبھی کبھار موسیقی کی محفلیں بھی جمتیں پھر قریب ہی میں ان کے اس ذاتی مکان میں کھانے کی دعوت ہوتی جو خانقاہ ہی کا ایک حصہ تھا۔ مجھے بھی ایک مرتبہ یہاں مدعو کیا گیا۔ میں اس سے لطف اندوز ہوا۔ اگرچہ زبان سے ناواقفیت کے سبب اکثر چیزیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ لیکن پھر بھی مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ میری خوشی کو خواجہ صاحب نے بھانپ لیا۔ اور مجھے دوبارہ بھی مدعو کیا۔ مشاعروں کی یہ تقریبات میرے ذہن پر ابھی تک نقش ہیں۔ خواجہ صاحب ایک دبلے پتلے پستہ قد انسان تھے چھدری داڑھی تھی جس سے سفید بال جھانکتے تھے۔ کوئی زیادہ صاف ستھری آنکھیں بھی نہیں تھیں۔ لمبے لمبے گھنگھریالے بال تھے جو شانوں پر پڑے رہتے تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی اور وہ بڑی شفقت سے فولادی فریم کی عینک سے دیکھتے۔ میں انھیں بے حد پسند کرتا تھا۔

دلی میں میرے تیسرے موسم خزاں کی ابتدا تھی ایک دن سن لٹ سوتھ سائڈ کے سیکرٹریٹ کے دفتر میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ مجھے خواجہ حسن نظامی کا فون آیا۔ یہ ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں کا ذکر ہے۔ خواجہ صاحب نے دریافت کیا کہ میں ان کی دو یا تین روز بعد منعقد ہونے والی دعوت میں شریک ہو سکتا ہوں۔ میں نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے پھر اطلاع دی کہ دعوت میں زیادہ لوگ شریک ہوں گے۔ اور یہ میرے لیے کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہوگی کیونکہ اس میں لاہور سے آئے ہوئے اقبال بھی شریک ہوں گے۔ اور ان سے اسمبلی کے مسلمان ممبر ملاقات کریں گے۔ خواجہ صاحب نے مزید کہا کہ صرف میں ہی واحد انگریز وہاں ہوں گا اور کیا میرے لیے ایسی محفل کسی الجھن کا باعث تو نہیں ہوگی؟ میں نے کہا کہ کوئی ایسی پریشانی کی بات

نہیں اور ساتھ ہی میں نے یہ بھی پوچھا کہ میں اگر ہندوستانی لباس پہن کر آؤں تو کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میں یہ لباس کبھی کبھار اس لیے پہنتا تھا کہ پرانی دلّی کی سڑکوں اور گلیوں میں مجھے دیکھ کر لوگ اجنبیت محسوس نہیں کرتے، خواجہ صاحب یہ سن کر محظوظ ہوئے ـــــ میں دعوت کے دن جہلم کے علاقے کے مسلمانوں کا لباس زیب تن کر کے وہاں پہنچ گیا۔ کھانے کا آغاز ہوا تو مجھے میری توقع کے خلاف اقبال کی بائیں جانب کی نشست پر بٹھایا گیا۔ "میں کون ہوں" اس بارے میں کوئی وضاحت نہ کی گئی۔ میرے ایک پرانے دوست سر محمد یعقوب(۱) جو اس وقت لیجسٹیلو اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر کے عہدے پر فائز تھے اقبال کی دوسری جانب بیٹھے تھے۔ ان کے بالمقابل سر ظفر اللہ خان تھے، جو اس وقت بھی ایک ممتاز وکیل تھے۔ دین دار تھے۔ اور بڑے سرگرم احمدی یا قادیانی تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اقبال سے تعارف نہ ہونے کی صورت میں وہ میرے بارے میں کچھ پریشان سے تھے۔ میں خود اپنا تعارف کرانے یا اپنے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے جھجک محسوس کر رہا تھا۔ مولوی سر محمد یعقوب نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے کچھ چھیڑخانی شروع کی۔ اور جملے پر جملہ کسنا شروع کیا۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اقبال پر یہ ثابت کریں کہ میں یورپ سے آیا ہوا کوئی نو مسلم ہوں۔ میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے سر ظفر اللہ خاں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انھوں نے ڈانٹ کر سر محمد یعقوب کو تنبیہ کی کہ مذہب کے معاملے میں ایسا مذاق انتہائی شرمناک اور افسوسناک ہے۔ کچھ دیر اس ناخوشگواری سے محفل پر سکوت چھا گیا۔ میں مخمصے میں تھا کہ اچانک خیال آیا کہ اقبال کیمبرج میں مجھ سے کافی عرصہ پہلے رہ چکے ہیں۔ میں نے کہا میں کیمبرج سے ہوں۔ اس بات نے جادو کا کام کیا۔ اور ہم دونوں کیمبرج کی پرانی یادوں کی ورق گردانی کرنے لگے۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل جو ممتاز شخصیتیں کیمبرج میں رہ چکی تھیں اور جن سے اقبال واقف تھے ان کا تذکرہ ہونے لگا۔ میں تقریباً دس برس جونیئر ہونے کی وجہ سے ان شخصیتوں کا تذکرہ اپنی انڈر گریجویشن کے زمانے میں سن چکا تھا۔ ان ماہرین میں ٹرینٹی کے Mc Taggart تھے۔ جو اپنے زمانے میں کیمبرج کے بڑے فلسفی اور شکی گردانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ سورلے تھے۔ جو دوسرے ممتاز ماہر فلسفہ تھے۔ اور جو میرے کنگز کالج سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ان کو بارہا دیکھا تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا اس کے علاوہ پروفیسر براؤن تھے۔ جو فارسی دان تھے۔ پروفیسر براؤن ممتاز مستشرق بننے سے پہلے میڈیسن میں گریجویشن کر چکے تھے۔

اقبال کے لیے موضوع میں یہ تبدیلی بڑی خوش کن تھی۔ ناخوشگواری کی بوجھل فضا اب ہلکی ہونا شروع ہوئی۔ ان کی طبیعت پر جو گرانی سی تھی اب مجھے لگا کم ہو رہی ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ پروفیسر Mc Taggart کو فلسفی کی حیثیت سے قابلِ توجہ بنانے میں ان کی بیماری Agoraphobia (گزر ترسی یا کسی مقام پر جانے سے خوف) کا بھی بڑا ہاتھ ہے اقبال کو یہ افسوسناک حقیقت یاد تھی۔ میں نے اقبال کو کہا کہ کیسے مسحور ہو کر کنگز کالج کے انڈر گریجویٹ Mc Taggart کو ٹرینٹی کالج کی طرف جاتے دیکھتے اور اکثر Gibbs building کی دوسری منزل پر Louis dickens کے ساتھ انھیں محو گفتگو پاتے کہا جاتا تھا کہ یہ اکثر ہیگل کے فلسفے کے بارے میں کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہوتے۔ پھر Mc Taggast وہاں سے نکلتے اور ہم انڈر گریجویٹ انھیں کنگز کالج کے پائین باغ سے بڑے دروازے کی جانب دیکھتے وہ کنگز پیریڈ پر اکثر آہستہ خرامی کرتے ہوئے پائے جاتے۔

میں نے اقبال کو بتایا کہ ابتدا میں Mc Taggerat کی Agoraphobia کی بیماری شدید نہیں تھی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح دیواریں بھی چھوٹی نہیں تھیں مجھے کنگز کالج کی جامداد کو اب King's Parade سے علاحدہ کرتی ہیں بلکہ اس کے برعکس لوہے کا اونچا بڑا جنگلا تھا۔ جیسا کہ اب سینٹ ہاوس کی حفاظت کے لیے لگا ہوا۔ ہے یہ کھلے مقامات سے خوف کھانے والے Mc Taggart کے لیے بڑا سہارا تھا۔ یہاں وہ بدوضع پرانا لیکن ممتاز Don اکثر نظر آتا۔ مجھ جیسے کئی نوجوان Porter's lodge اور ٹرینٹی کے درمیان اکثر منڈلاتے رہتے مجھے یاد ہے کہ Mc Taggart کے جوتوں کے تسمے شاذونادر ہی بند ہوتے۔ وہ پرانا

اوور کوٹ پہنے ہوتے۔ سینٹ ہاوس کے نزدیک کھلے میدان کے پاس ان کا وہی پرانا مسئلہ شروع ہو جاتا جسے ہم سب نوجوان شوق سے دیکھتے یعنی یہاں ذرا دیر رکتے ہمت باندھتے اور قابلِ رحم لیکن مضحکہ خیز حالت میں خوفزدہ سے ہو کر پوری تندہی سے دوڑتے Trinity street کے تنگ راستے میں پہنچ کر اپنے حواس درست کرتے۔ اور پھر معمول کے مطابق چلنے لگتے ___ مجھے لگا اقبال میرے ساتھ کیمبرج کی پرانی یادوں میں بے حد دلچسپی لے رہے ہیں۔ میرے اس واقعہ سنانے پر اقبال نے مجھ سے اتفاق کیا کیونکہ وہ خود Mc Taggart کی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ تھے اور اس کے لیے بڑے ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے۔

اقبال کو سورلے کی زندگی کے ایک المناک واقعہ کا قطعاً علم نہیں تھا۔ انھوں نے دریافت کیا تو میں نے بتایا کہ سورلے کا ایک نوجوان بیٹا جو ادبی شخصیت کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔ کالج Chapal میں ایک War Memorial بنوایا گیا جس پر کیمبرج کے ان تمام گریجویٹس کے نام کندہ تھے۔ جنھوں نے جنگ عظیم میں زندگیاں قربان کیں۔ ایک پرانا ہینگرین طالب علم جو دشمنوں کی طرف سے لڑتے ہوئے قتل ہوا تھا اس کے نام کو شامل کرنے کا مسئلہ کالج کونسل کے لیے بڑا پیچیدہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے شدید مخالفت کی لیکن بعد میں معاملہ سلجھ گیا۔ اور Fernce Bekassy کا نام War Memorial میں شامل کرنے کے لیے کالج کونسل رضامند ہو گئی ___ لیکن اس نام کو علاحدہ تختی پر کندہ کروا کے نصب کیا گیا۔ سورلے نے اس ہینگرین کے نام کی شمولیت پر بڑی ناراضگی کا اظہار کیا اسے نہ صرف انگریزوں کی ہتک گردانا بلکہ اپنے مرحوم بیٹے کے لیے ناقابلِ برداشت توہین سمجھا جس کے لیے اس نے جان دی تھی۔ ہم کئی انڈر گریجویٹس جو ۱۹۲۱ء میں وہاں تھے کالج کونسل کے اس فیصلے کو صحیح سمجھتے تھے اور سورلے کو ایک تنگ نظر اور متعصب انسان گردانتے تھے۔ مجھے یاد ہے اقبال نے یہ سب بڑی دلچسپی سے سنا لیکن اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ ایک فلاسفر کی حیثیت سے سورلے کے بارے میں اقبال کی کیا رائے تھی کیونکہ Mc Taggart فلاسفر کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک زیادہ اہم مقام کے مالک تھے۔

اس شام کیمبرج ___ موضوع گفتگو رہا۔ مولوی سر محمد یعقوب اور سر ظفر اللہ کے درمیان تلخ اور ناخوشگوار گفتگو کی ابتدا کے باعث اس موضوع سے محفل کا رنگ بدل گیا۔

میرے لیے یہ ۱۹۳۲ء کے دلّی کی ایک دلچسپ اور یادگار شام تھی۔

حاشیہ:

(۱) مولوی سر محمد یعقوب غیر منقسم ہندوستان کی سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے پہلے ڈپٹی پریذیڈنٹ اور بعد میں پریذیڈنٹ مقرر ہوئے تھے۔

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت

انسانم آرزوست

(عصرِ اقبال میں اقبال کے تصور انسان کی ضرورت)

شاہدہ یوسف

عصرِ اقبال فکروخیال کی شکست و ریخت کا وہ دور اہا ہے۔ جہاں زندگی کی اقدار مشتبہ ہو چکی تھیں۔ زندگی ایک تہذیبی جمود اور تعطل کا شکار تھی۔

عالمِ اسلام کے منظرنامے پر ایک تصادم اور خلفشار کی کیفیت تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ مغربی استعمار نے مختلف اسلامی ممالک کو دبوچ لیا تھا لے دے کہ ایک ترکی کا آزاد وجود تھا مگر اسے بھی مختلف یورپی قوتوں نے گھیر رکھا تھا۔

جسٹس ایس اے رحمان "ایقان اقبال" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "اقبال نے دنیا میں اس وقت آنکھ کھولی جب اس برِصغیر میں سلطنتِ اسلامیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ اُمت مسلمہ ہر خطے میں ذہنی قنوطیت کا شکار تھی۔ مغربی سامراج اور استعماریت کا قابوس افریقہ اور ایشیا کے سینے پر سوار تھا۔" (۱)

طرابلس میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ بلقان میں بھی ترکوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

غرضیکہ دنیائے اسلام بتدریج مائل بہ زوال تھی۔ یہ وقت مسلمانانِ عالم کے لیے بڑا تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔

بلقان کی جنگ اور طرابلس کا معرکہ مسلمانوں کو خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ اقبال کو اسلامی ملکوں کی زبوں حالی اور سیاسی پستی کا شدید احساس تھا۔ مشہور مفکر جمال الدین افغانی سے اس سلسلے میں ان کی ملاقاتیں بھی رہیں اور خود سید جمال الدین نے کافی عرصہ تک اقامت اختیار کی۔

یورپ کی حریص نظریں اسلامی ممالک کو ہتھیا لینے کے درپے تھیں۔

خلافتِ عثمانیہ اندرونی ریشہ دوانیوں اور عربوں کی دوغلی پالیسیوں کے سبب بے انتہا کمزور ہو چکی تھی۔

منشی محمد دین فوق اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

> "۱۹۱۵ء! ۱۹۱۴ء کی تاریخ نے مسلمانانِ عالم کے لیے کربلائے جدید کا نیا باب کھولا... خلافتِ اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کو اور اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے کو تھا۔" (۲)

ٹیونس اور الجزائر فرانس کی بدنیتی کا شکار تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس کو اور زار روس نے مشہد اقدس کو بزدلانہ حملوں کا شکار بنایا۔ برطانوی حکومت نے شاطرانہ چالوں کے ذریعے مہدی سوڈانی کی تحریک کو ختم کرنے کے بعد مصر کو غلامی قبول کرنے پر

مجبور کر دیا۔

افغانستان پر بھی برطانوی آمریت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ایران روس اور برطانیہ کی ڈپلومسی کا شکار بنا ہوا تھا۔ ترکی کی وسیع سلطنت منتشر ہو چکی تھی۔

علامہ اقبال نے اپنے ایک مقالے "قومی زندگی" میں اس صورتِ حال کا یوں تجزیہ کیا:

"یہ بد قسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے... اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے بیٹھی ہے۔" (۳)

اطالیہ کی چیرہ دستی نے طرابلس کو زخم خوردہ کر دیا تھا بلقان کی عیسائی ریاستیں انٹی نیگرو، یونان، بلغاریہ اور رومانیہ کی شہ پر آمادۂ پیکار تھیں۔

"جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد دنیائے اسلام میں ایک مملکت بھی آزاد باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہمارے تمام جھنڈے سرنگوں تھے...

جزیرۂ عرب پر سے ترکوں کا تسلط ختم ہو گیا وہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے قدم جما لیے۔" (۴)

عراق، اُردن اور شام کا فلسطینی حصہ انگریزی اقتدار کی نذر ہوا، فلسطین کے سوا سارا شام فرانسیسیوں کے سپرد تھا، ایران کے جنوبی حصے پر انگریزوں کی فرمانروائی اور شمالی حصے پر روس کی مصر و عدن، ملایا وغیرہ بہت سے علاقے برطانوی اقتدار کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

برِصغیر پاک و ہند میں اُمتِ مسلمہ کے جاہ و جلال کا سورج غروب ہو چکا تھا۔

جزائر شرق الہند یعنی انڈونیشیا وغیرہ پر ہالینڈ Holland کا قبضہ تھا۔

برصغیر کی بساط پر بھی ایک مدوجزر کی کیفیت تھی ہندو تحریکات کے زیر اثر بہت سے سانحات سے اُمتِ مسلمہ کا سابقہ پڑا سانحہ کانپور بھی اس دور کے اندوہناک واقعات میں سے ایک ہے۔ دنیا ایک عالمی جنگ کے جہنم زار سے نکل کر دوسری عالمی جنگ کے جہنم زار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور مسلم اقوام کا تشخص مغربی اقوام کے ذوقِ مہم جوئی اور جوع الارض کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔

"برِصغیر پاک و ہند کے مسلمان جن کی سطوت و شوکت کبھی پورے برِ عظیم میں جلوہ بار تھی۔ اب برطانیہ کے کہنہ مشق غلام بن گئے تھے۔" (۵)

اس دور میں اُمتِ مسلمہ تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اسلامیانِ برصغیر فرقہ بندی، تعصب اور باہمی پیکار کی مسموم فضا میں سانس لے رہے تھے۔

غرضیکہ عصرِ اقبال انگریزی سامراج، برطانوی شہنشاہیت اور نو آبادیات کے تسلط میں جکڑا ہوا وہ زمانی منطقہ ہے۔ جسے اقبال نے عالمِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز سمجھا۔ وہ اُمتِ مسلمہ کے اُفق پر انتشارِ سحر کے منظر کو فروغِ صبح میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔

اس تناظر میں ان کا تصورِ مردِ کامل اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک نئی سحر کی بشارت ہے۔ تہذیبی اور سیاسی آشوب کے اس کڑے لمحے میں وہ ایک ایسی نویدِ جانفزا ہے جو تاریخ کے تسلسل میں اپنی ذات کے امکانات سے ایک نئی جہت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ ملتِ اسلامیہ کا ایک ایسا نظریاتی اور عملی ہتھیار ہے جس سے اقوامِ عالم کی ہمہ گیر یلغار کو روکا جا سکتا ہے۔ اقبال کا نصب العینی انسان زمانے کے ہر چیلنج کا جواب ہے اس کا وجود تہذیبی سیاسی اور اخلاقی اقدار کی بازیافت کے لیے ہر دم برسرِ پیکار نظر آتا

ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کے رواں دھارے میں اُمتِ مسلمہ کی بقا کا باعث ہے۔

خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں

کارواں زیں وادیٔ دور و دراز آید بروں(۶)

جس زمانی و مکانی سیاق و سباق میں اقبال نے تصورِ مردِ کامل کی تشکیل کی وہ اگرچہ تاریخی طور پر اُمتِ مسلمہ کے ابتلا کا عہد تھا۔ لیکن انحطاط و ابتلا کا یہی دور مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ اسی مرحلۂ خود احتسابی میں اقبال نے اپنے نظامِ فکریات میں ایک ایسی نصب العینی شخصیت کی تخلیق کی جو مزارِ تقا سمجھتی ہے۔ اور جس کے قلب و جاں میں تسخیر شش جہات کی لگن ہے۔ وہ اس دور کی آتش افسردہ کو اپنے سوزِ نفس سے آتشکدہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے اس موڑ پر اقبال کے انسان کامل کی اہمیت ایک آفاقی حقیقت ہے اس لیے کہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی انسانیت کے لیے اقبال کے پاس ایک دستور حیات ہے۔ اپنے مقام سے آگہی کی نوید ہے اور عہدِ حاضر کے مسائل کا حل ہے۔ اقبال کا تصورِ انسان کامل کوئی مجرد فکری حقیقت نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کہتے ہیں:

"انسانِ کامل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے قوتِ حیات کی تجدید کرتا ہے... وہ تاریخ کی تخلیقی رو کو جدھر چاہے موڑ دیتا ہے۔"(۷)

اقبال کا مردِ کامل تعیش پسندی اور تساہل کے دور میں اپنے اندر خارا شگافی کی صفات رکھتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں اپنی روحانی قوت کے بل بوتے پر عیش کوش اور آرام پسند لوگوں کے ہجوم میں منفرد نظر آتا ہے۔

اقبال کا انسانِ کامل محض اُن کی تخلیقی فعالیت کا شاہکار نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کے لیے حیاتِ جاوداں کا ایک پیغام ہے:

"اقبال کا مردِ مومن زندہ جاوید ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیغام رکھتا ہے۔ اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے اور اُس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لیے گزرتی ہے۔"(۸)

انحطاط و ہزیمت کے اُس دور میں جب زندگی کے سارے امکانات مشتبہ ہو چکے تھے اقبال کے انسانِ کامل کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ ان کا انسان کامل اسلامی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے ہر مرحلے کی آبیاری کر سکتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں بلاشبہ ہزار در ہزار ہیں۔ اس کے انفرادی کارناموں میں اجتماعی احساس اور شعور کارگر ہوتا ہے۔ وہ ثبات اور تفسیر کا رازداں ہے۔ عصرِ اقبال میں ہی نہیں آنے والے ادوار میں بھی اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی فروغ کا ذریعہ ہے۔ وہ انسانیت کی کشتِ وجود کے آبِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقوامِ عالم کی سیاسی حیات کے اس دوراہے پر وہ زندگی میں مثبت اقدار کے قیام کی نوید ہے۔

اقبال کا تصور "انسانِ کامل" انسان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ وہ خدا کے علم بسیط کا وارث ہے اور وہ نیابتِ الٰہی کا سزاوار ہے وہ اپنی اور کائنات کی غایت جاننے کے لیے ہر لمحہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

یوں تو انسان کامل کی اہمیت اس کے معرضِ تخلیق میں آنے سے پہلے ہی ذاتِ باری تعالیٰ نے متعین کر دی تھی۔

اِنّی جَاعِلٌ فی الارضِ خلیفۃً (سورۃ بقرہ آیت ۳ پارہ ۱)

اس آیتِ مقدسہ سے انسان کا روئے زمین پر خدا کا خلیفہ ہونا ثابت ہو۔

وَلقد کرّمنا بنی آدم (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۰)

اور یہ کہ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین (المنافعون، آیت ۸)

لیکن انسانِ کامل کی اہمیت حیاتِ انسانی کے ان ادوار میں جن میں زندگی کی منفی اقدار کا گورکھ دھندا بن کر رہ جائے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بے عملی اور جمود میں اقبال کا تصور انسانِ کامل تحرک اور جوشِ حیات کا موید ہے۔ اس سیاسی اور زمانی صورتِ حال میں (۹) "علامہ اقبال نے جب تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ صالح انقلاب ہمیشہ مردِ مومن کا مرہونِ منت رہا ہے۔ اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ وہ دنیا کے اس خرابے میں بے جہت و بے زمام سیاست کو انسانی اوصاف سے مزین کرنا چاہتا ہے۔ وہ گم کردہ راہ انسانیت کو سرافرازی اور سربلندی کی راہیں دکھانا چاہتا ہے۔

ان کا انسان کامل ان کے عصر ہی کی نہیں آنے والے اعصار کے لیے بھی بڑی فضیلت و اہمیت رکھتا ہے۔ وہ انحطاط پذیر انسانی معاشرے میں اقدار کی تشکیلِ نو کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ تصور انسانِ کامل کی وساطت سے:

"اقبال مسلمانوں کی تاریخ کے کسی گزرے ہوئے عہد کی تکرارِ تمنا کی بجائے اسلام کے ان خفتہ امکانات کو بیدار اور سرگرمِ کار کرنے میں کوشاں تھے جو آج تک کبھی بروئے کار ہی نہیں آسکے۔" (۱۰)

اسلامی صورت حال کے اس منظرنامے پر اقبال کا نصب العینی انسان زندگی کے ہر چیلنج کا جواب بن کر سامنے آیا ہے۔ وہ اُمتِ مسلمہ کے آفاقی نصب العین کو عملی زندگی کے ٹھوس قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

لایزال و وارِ داتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دمے

(جاوید نامہ)

عصرِ اقبال میں تصورِ انسانِ کامل تصورات اور اتحادِ انسانی کی اساس بھی ہے۔ اور عالمگیر اخوت و مساوات کا پیغام بھی وہ اپنی ہتھیلی پر انقلاب کا سورج لے کر انسانیت کی رات کو سحر بکنار کرنا چاہتا ہے۔

مسلمانانِ عصرِ حاضر کے سامنے عالمی صورتِ حال عہدِ نمرود بن کر کھڑی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو اسی آگ کو گلزار بنانے کا چیلنج درپیش ہے۔

اقبال کا انسان کامل بیسویں صدی میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار کے خلاف ایک سربکف مجاہد کی طرح ڈٹ کر کھڑا ہے۔

عصرِ اقبال اُمتِ اسلامیہ کی تاریخ کا وہ نازک موڑ ہے جس میں مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی ہستی کی بقا کے لیے انسانِ کامل کا تصور ایک حیات افروز اور ولولہ انگیز تصور ہے ایسا تصور جو عصرِ اقبال کے فتنوں کا ہی نہیں آنے والے دور کے فتنوں کا بھی جواب ہے۔ انسان کامل اقبال کا ہی نہیں پوری اُمتِ مسلمہ کا خواب ہے۔ وہ خالقِ حقیقی کی کائنات میں ایک مرکزی و کلیدی شخصیت ہے جس کی ذات کا ارتقا مقصودِ خداوندی ہے۔

جس کی شخصیت صفاتِ الٰہیہ کی مظہر ہے۔ (۱۱)

اقبال جاوید نامہ میں بجا طور پر کہتے ہیں۔

آیۂ تسخیر اندر شان کیست؟
ایں سپہر نیلگوں حیرانِ کیست؟
رازدانِ علّم الاشیا کہ بود؟
مستِ آں ساقی و آں صہبا کہ بود؟
برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟
کردی از رازِ دروں محرم کرا؟
اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سُفت
حرف اُدعُونی کہ گفت و باکہ گفت؟

(جاوید نامہ)

اس اقرارِ استفہامیہ میں انسان کی ذات کی اہمیت اور مرکزیت اور اس کی ذات کے غیر مختتم احکامات کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔

اقبال کے "انسانِ کامل" کی ہمہ گیری اور جامعیت مفکرینِ عالم میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔

مشرق و مغرب کے نظامِ فکریات میں ایک مردِ منتظر کا تصور کسی نہ کسی انداز میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ کم و بیش ہر زمانے کے فلسفی اپنے فکر و تخیل کی سطح پر ایک انسانِ کامل کا پیکر تراشتے رہے۔ غیر مسلم فلاسفرز میں افلاطون، ارسطو، نٹشے، کارلائل اور اربندو گھوش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ایک مثالی انسان کا تصور اور قدیم مسلمان مفکرین میں شیخ محی الدین ابنِ عربی، عبدالکریم جیلی، مولانا جلال الدین رومی اور شیخ محمود شبستری کے یہاں بھی انسانِ کامل کا تصور ملتا ہے۔

اقبال کے ناقدین و مبصرین میں بعض نے یہ خیال آرائی کی کہ اقبال کا تصورِ انسانِ کامل نٹشے کے تصورِ فوق البشر سے ماخوذ ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر ای جی براؤن کا یہ بیان توجہ طلب ہے۔

"اقبال کے تمام فلسفہ کی اساس نٹشے کا فلسفہ اور ان کا انسانِ کامل نٹشے ہی کے فوق البشر کا مثنیٰ ہے" (۱۲)

کچھ جزوی مماثلتوں کی بنا پر اقبال جیسے نابغۂ روزگار فلسفی اور مفکر کے تصورِ انسانِ کامل کو نطشے کے خیالات کی بازگشت قرار دینا ایک ادبی و فکری خیانت ہے۔ اقبال کا یہ تصور اسلام کی کتاب الحکمت یعنی قرآنِ حکیم سے ماخوذ ہے۔

ویسے بھی یہ مردِ مومن جسے مردِ منتظر بھی کہا گیا ہے ہمارے حکما کے اپنے افکار میں اس وقت بھی موجود تھا۔ جب مغرب میں ابھی اس کی تکمیل یافتہ صورت ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ (۱۳) نطشے کا فوق البشر اخلاقی پابندیوں سے آزاد نیکی اور عدل کی بجائے قوت کا قائل اور بزورِ شمشیر غلبہ و اقتدار کے حصول کا متمنی ہے جو ضمیر، گناہ، موت، دوزخ رحم اور عدل جیسے جذبات کو انسان کی کمزوری پر محمول کرتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ وہ خدا کے وجود کا بھی منکر ہے۔

"نیکی اور عدل کو تباہ کردو۔ میری خاطر تباہ کردو۔" (۱۴)

برٹرینڈرسل اپنی کتاب "History of Western Philosophy" میں لکھتے ہیں (یہ بات انھوں نطشے کے فلسفۂ فوق البشر کی وضاحت میں کہی ہے)

"The noble man will be capable of cruelty and on occasion, what is vulgarly regarded as crime, He will recognize duties only to cquals."(15)

ان کی ان غیر اخلاقی تعلیمات سے یقیناً اقبال کے تصور کامل کو کوئی نسبت نہیں ہو سکتی Nitzcse کا فوق البشر اندھی قوت کا دلدادہ ہے اور اقبال کا انسانِ کامل اوصافِ عالیہ کا جیتا جاگتا پیکر! نطشے کے بارے میں برٹرینڈرسل اپنے خیالات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"He condem ns christian love because he things it is an outcome of fear: I am afraid my neighbour may injureme, and so I assure him that I love him. If I were stronger and balder I should openly display the contempt for him which of course I feel."(16)

اس کے برعکس اقبال کا انسان کامل قرآن کریم کی اس آیت جلیلہ کی تفسیر ہے۔

"اَشِدَّاءُ عَلَی الکُفّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُم" (سورۃ الفتح، پارہ ۲۶ آیت ۲۹)

مفکرینِ عالم میں اقبال کے تصورِ انسانِ کامل کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر اینمیری شمل کہتی ہیں۔

"یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ اقبال مردِ مومن کے تصور پر اس وقت بھی غور کرتے رہے جب نطشے کے افکار سے وہ آگاہ نہ تھے۔"(۱۷)

اقبال کے انسانِ کامل کے تنِ محکم میں ایک خدا ترس اور دردمند انسان کا دل ہے جس نے خدا سے لو لگا رکھی ہے وہ خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہے، وہ تمام اخلاقی قوانین اور خدا کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے رزم گاہِ حیات میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس کی ذات میں تخلیقِ مقاصد کی صلاحیت بھی ہے اور جفا طلبی کا حوصلہ بھی اس کی آرزوئیں قلیل ہیں اور مقاصد جلیل:

مقصدِ مثلِ سحر تابندۂ
ماسوئی را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسماں بالا ترے
دلربائے دلستانے دلبرے

باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے، سراپا محشرے(۱۸)

(اسرار و رموز)

اقبال کا انسانِ کامل نطشے کے فوق البشر کی طرح جسمانی قوت کو زندگی کا منتہائے مقصود نہیں سمجھتا بلکہ مقاصد جلیلہ کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے جس کی تمام سعی و عمل اور جدوجہد کا مقصد "حکومت الٰہیہ" کا قیام ہے۔

یہی وہ خصوصیت ہے جو اقبال کے انسانِ کامل کو نطشے کے فوق البشر سے ممتاز کرتی ہے۔"(۱۹)

مفکرینِ عالم میں افلاطون نے اپنے فلسفیانہ افکار کی مثالی شخصیت تو "فیلسوف" سمجھا ہے۔ ارسطو نے مثالی انسان کہہ کر پکارا ہے اور اروبند گھوش نے اس کے لیے مردِ کامل کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

افلاطون کا فیلسوف وسیع علمِ ظاہری و باطنی کا مالک، بہترین اخلاق سے مزین، جسمانی اور روحانی طور پر ہر عیب سے پاک اور عروج وکمال کی تمام صفات و شرائط کا حامل ہے۔

ارسطو کے مثالی انسان کا تصور یہ ہے کہ وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا اور نوعِ انسانی کی خدمت یہ ہے کہ وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا اور نوعِ انسانی کی خدمت کرنا چاہتا ہے اس کے نزدیک رحم اور مہربانی برتری کی علامت ہے۔ جبکہ رحم اور مہربانی کی درخواست کرنا کمزوری کی دلیل ہے۔ زندگی کے حادثات کو وہ صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور ایک قابل سپہ سالار کی طرح اپنے محدود وسائل کو نہایت دور اندیشی سے استعمال کرتا ہے۔

برٹرینڈرسل اپنی "تاریخ فلسفۂ مغرب" میں لکھتے ہیں:

"The best individual as conceived by Aristotle, is a very different person from a christian saint. He should have a proper pride and not underestimate his own merits."(20)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو کے "مثالی انسان" اور اقبال کے "مردِ کامل" میں خاص مشابہت ہے۔ ارسطو کے مثالی انسان کی طرح اقبال کا مردِ کامل بھی منتِ غیر سے اجتناب کرتا ہے۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر

(اسرارِ خودی)

اقبال کے انسانِ کامل کے سارے فلسفے کی اساس حکمتِ قرآنی ہے۔ ان کی فکر کا سرچشمہ فیضان قرآنِ کریم ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

ولا تزرُ وازرۃ وزرَ اُخریٰ (پارہ ۲۲ سورۃ فاطر آیت ۱۸)

ترجمہ: کوئی دوسرے آدمی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

اروبند گھوش کے مطابق:

"انسان کے تمام لازمی عناصر میں ایک ملکوتی عنصر بھی ہے جس کے ارتقاء سے انسان فوق البشر ہو سکتا ہے۔ یہ عنصر ذات مطلق کا عکس ہے لیکن ذاتِ مطلق اور انسان کے جوہر میں اتنا فرق ضرور ہے کہ جو چیز اوّل الذکر میں غیر محدود ہے۔ وہ ثانی الذکر میں محدود اور اضافی حیثیت رکھتی ہے۔"(۲۱)

مسلم مفکرین میں شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کچھ یوں ہے:

"تخلیقِ کائنات کا سبب حقیقتِ محمدیہ ہے اور جس طرح انسان تمام کائنات میں اشرف و اکمل ہے۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام افراد انسانی میں اشرف و اکمل ہیں اور حقیقت میں رسول اکرم صلی علیہ وسلم انسانِ کامل ہیں.... حقیقتِ محمدیہ حقیقتِ حقائق ہے جو انسانِ کامل کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔(۲۲)

شیخ عبدالکریم جیلی نے بھی اپنی کتاب "الانسان الکامل فی معرفتہ الاخیر وراوائل" میں لکھتے ہیں:

"انسان بجائے خود ایک عالم ہے جوخدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے۔ انسانی ہستی ذاتِ باری کی خارجی شکل ہے... ذاتِ انسانی کے توسط سے ذات مطلق خود اپنا مشاہدہ کرتی ہے... حضرت رسول کریم محمد علیہ صلوۃ والسلام نے انسان کامل کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا۔"(۲۳)

مولانا جلال الدین رومی اپنے انسان کامل کی بنیاد قانونِ ارتقا پر رکھتے ہیں جس کے مطابق انسان اپنی تکمیل سے پہلے جمادی نباتاتی اور حیوانی منازل سے گزرتا ہے پھر درجہ انسانی تک پہنچتا ہے۔ چونکہ قانونِ ارتقا جاری ہے اس لیے انسان اپنے روحانی کمالات کی بدولت فرشتوں کے مقام تک پہنچ جاتا ہے شیخ محمود شبستری کی مثنوی "گلشنِ راز" کے مطابق انسان جب عروج و تکمیل کے بعد انسانیت کے درجہ کمال تک پہنچتا ہے تو وہ انسانِ کامل کے لقب سے سرفراز ہوتا۔ انسانِ کامل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جن کی ذات نقطۂ اختتامِ کمال انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت آپ کی ذاتِ اقدس میں بدرجہ کمال پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نبوت کا خاتمہ تو حضور اکرم کے وصال کے ساتھ ہو گیا لیکن ولایت باقی ہے اور اولیائے کرام جو انسانوں کی رُشد وہدایت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں ان میں ہی کوئی آخری ولی بھی ہوگا جو رسولِ خدا سے گہری نسبت کے باعث عالم کا پیشوا اور اولادِ آدم میں سے اس زمین پر خلیفتہ اللہ ہوگا۔

اقبال شیخ محمود کے اس نظریے سے متفق نہیں کہ انسانِ کامل رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کے بعد آئے گا۔

ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین رقم طراز ہیں:

"اقبال کے مطابق انسانِ کامل ایک مردِ مومن یا مردِ حق ہی ہے جسے ایک سچا مسلمان بھی کہا جا سکتا ہے ان کا کہنا ہے کہ انسان خدا کی وحدانیت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دل سے اقرار کرے... یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر مردِ مومن نیابت الٰہی جیسے اہم اعلیٰ منصب پر فائز ہوتا ہے۔ اور وہ خدا کی طرف سے قضاوقدر کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔"(۲۴)

مشرق و مغرب کے مفکرین کے تصور انسان کا جائزہ لینے کے بعد اقبال کی انفرادیت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ اقبال کا تصورِ انسان کامل مفکرین عالم کے ساتھ جزوی مماثلتیں ضرور رکھتا ہے لیکن یہ اپنی ترکیب و ترتیب میں ایک خاص مزاج اور بنت رکھتا ہے یہ ایک well knit, well woven اور intricate تصور ہے جو مغربی مفکرین کے اس تصور سے بہت مختلف ہے جس کی صفات حکمرانوں کی ضرورتیں متعین کرتی ہیں۔

جس تہذیب میں مادہ پرستی کی پوجا ہو وہاں بڑی شخصیات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔

"اونا مونو نے کئی قسم کے انسان گنوائے ہیں مثلاً ارسطو کا بے پروں والا دوپایہ، مانچسٹر اسکول کا معاشی انسان، لینوس کا عقل رکھنے والا انسان، روسو کا معاشری عہد نامے والا انسان۔"(۲۵)

روسو کے روحانی تصورات کا حامل انسان جس کے بعض فکری اجزا کے بارے میں برٹرینڈرسل کہتے ہیں:

"The cult of the hero as developed by carlyle and Nietzsche is typical of this philosophy."(26)

الغرض روسو (Rausseay) فختے (Fichte) کارلائل (Carlyle) اور نطشے (Nietzsche) کے انسانی تصورات کی اساس اس "نفرت" پر مبنی ہے جس نے صنعتی نظام کی کوکھ سے جنم لیا۔ ان کے تصورات انسان میں باغی انسانوں کا سا انداز جو بغاوت کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں "Right of Rebellion" ان کے یہاں ایک اجتماعی احساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض وہ اسلام کی فکری تاریخ کا مردِ منتظر ہو یا فکر یونان کا مثالی انسان وہ مغربی ادب کا رومانی انسان ہو یا روسی ادب کا اشتراکی انسان یا پھر امریکہ اور اصلِ مغرب کی بساطِ سیاست پر ایک مہرے کی طرح استعمال ہونے والا جمہوری انسان۔

انسان کے یہ سارے تصورات اپنے اندر جزوی نقائص اور قباحتیں رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کا تصورِ انسان کامل ایک ہمہ جہت تصور ہے وہ مغربی تصورِ انسان کی طرح کسی وقتی ہیجان کا اشتعال انگیز نتیجہ نہیں بلکہ اس کی اساس اور ماخذ قرآن سنت کے لایزال سرچشمے ہیں۔ اقبال نے اس قرآنی تصور انسان کی تعمیرِ سیرت کے لیے باقاعدہ ایک نظامِ تربیت ترتیب دیا ہے۔ جس کے مراحل (۱) اطاعت (۲) ضبطِ نفس اور (۳) نیابتِ الٰہی ہیں۔

"مسلم تودۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے۔" (۲۷)

اقبال کے انسان کا کائنات کے ارتقا میں ایک Contributaryfactor ہے وہ مازاغ البصر و ماطغیٰ کے منصب سے بہرہ ور ہے (نہ نظر کج ہوئی نہ اس نے کم زیادہ دیکھا)

وہ خاک سے جنم لے کر بھی اطراف و جہات کی قیود توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے، سپہرہائے نو بہ نو اور ارض و سما کی وسعتیں اس کی تگ و تاز کا میدان ہیں۔ وہ حور و فرشتہ کو اپنے ورطۂ احساس کی گرفت میں لا سکتا ہے جبریل اس کے دشت امکانات میں ایک صیدِ زبوں ہے۔ اس کے نظامِ اخلاقیات میں کسی اخلاقی بے راہ روی کی گنجائش نہیں۔ وہ منفی جذبات کی تنقیح کر کے انھیں راہِ راست پر لانا جانتا ہے۔ وہ نطشے کے فوق البشر کی طرح اندھی قوت کا پجاری نہیں اس کے مقام و مرتبہ کو عالی مفکرین کا کوئی تصور انسان نہیں پہنچ سکتا۔

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او برنتابد ہمسرے

خرقۂ لاتحزنو اندر برش
انتمُ الاعلون تاجے برسرش
می کشد بارِ دو عالم دوشِ او
بحر و بر پروردۂ آغوش او(۲۸)

(رموزِ بے خودی)

حواشی:

(۱) محمد منور پروفیسر، "ایقانِ اقبال"، ص ۵ اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۸ء۔

(۲) نیرنگِ خیال اقبال نمبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۱، مقالہ (ڈاکٹر شیخ محمد اقبال) مقالہ از منشی محمد دین فوق۔
(۳) سید عبدالواحد معینی (مرتب) "مقالاتِ اقبال"، ص ۸۷، آئینۂ ادب چوک مینار انار کلی لاہور ۱۹۸۸ء۔
(۴) پروفیسر مرزا محمد منور، "برہانِ اقبال"، ص ۴۰، اقبال اکادمی پاکستان۔
(۵) مرزا محمد منور "برہانِ اقبال"، ص ۴۰، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۷ء۔
(۶) محمد اقبال "زبورِ عجم"، ص ۱۰۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، سن ندارد۔
(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان "روحِ اقبال"، ص ۲۱۶۔
(۸) سید ابوالحسن علی ندوی "نقوشِ اقبال"، ص ۱۲۱، مجلس نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء۔
(۹) سید ابوالحسن ندوی "نقوشِ اقبال"، ص ۱۲۳، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء۔
(۱۰) فتح محمد ملک پروفیسر "اقبال فکر و عمل"، ص ۴۷، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۔
(۱۱) ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین "افکار و تصوراتِ اقبال"، ص ۱۵۸، کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۹۳ء۔
(۱۲) واجد رضوی "دانائے راز"، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۷۔
(۱۳) احسان اکبر "اقبال فکر و فلسفہ" (اقبالیات ۲)، ص ۵۴، المسطر راولپنڈی مئی ۱۹۹۰ء۔
(۱۴) واجد رضوی "دانائے راز"، ص ۱۴۷، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۷ء۔
(۱۵) Bertrand russel "History of western philosophy" Routledge 1991, pg733.
(۱۶) Bertrand russel "History of western philosophy" Routledge 1991, pg734.
(۱۷) پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل "شہرِ جبریل"، ص ۱۵۳، گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۵ء۔
(۱۸) محمد اقبال "اسرار و رموز"، ص ۱۷، غلام علی پرنٹرز ۱۹۹۰ء۔
(۱۹) فضل الٰہی عارف "متاعِ اقبال"، ص ۶۵ شیخ غلام اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۷ء۔
(۲۰) Bertrand russel "History of western philosophy", Routledge 1991, pg187.
(۲۱) بحوالہ واجد رضوی "دانائے راز"، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۶۔
(۲۲) بحوالہ ایس ایم منہاج الدین "افکار و تصوراتِ اقبال" ص ۱۴۹، کاروانِ ادب ملتان صدر۔
(۲۳) بحوالہ ڈاکٹر یوسف حسین خان "روحِ اقبال"، ص ۲۹۳، آئینۂ ادب لاہور
(۲۴) ایس ایم منہاج الدین "افکار و تصوراتِ اقبال"، کاروانِ ادب ملتان ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۲-۱۵۳۔
(۲۵) محمد حسن عسکری "مجموعہ حسن عسکری"، ص ۳۷، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء۔
(۲۶) Bertrand russel "History of western Philosophy" Routledge 1991, pg580.
(۲۷) محمد اقبال "مکاتیب اقبال بنام گرامی"، ص ۱۴۷، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۱۹۶۹ء۔
(۲۸) محمد اقبال "اسرار و رموز"، ص ۱۶۴، غلام علی پرنٹرز۔

کتابیات:

(۱) احسان اکبر — "اقبال فکر و فلسفہ" (اقبالیات ۲) — المسطر راولپنڈی ۱۹۹۰ء
(۲) ایم ایم منہاج الدین — "افکار و تصوراتِ اقبال" — کاروانِ ادب ملتان صدر ۱۹۸۵ء

(۳) این میری شمل پروفیسر ڈاکٹر (مصنف) محمد ریاض ڈاکٹر و مترجم	"شہرِ جبریل"	گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۵ء
(۴) پروین شوکت علی (مصنفہ) ریاض الحق عباسی و مترجم	"اقبال کا فلسفۂ سیاسیات"	شیخ غلام علی اینڈ سنز، سن ندارد
(۵) جگن ناتھ آزاد	"اقبال اور مغربی مفکرین"	مکتبہ عالیہ سن ندارد
(۶) سید ابوالحسن ندوی	"نقوشِ اقبال"	مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی ۱۹۷۲ء
(۷) سید عابد علی عابد	"شعرِ اقبال"	بزمِ اقبال لاہور ۱۹۷۷ء
(۸) سید عبداللہ ڈاکٹر	"مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ"	بزمِ اقبال لاہور ۱۹۸۴ء
(۹) سید عبدالواحد معینی (مرتب)	"مقالاتِ اقبال"	آئینۂ ادب لاہور ۱۹۸۸ء
(۱۰) عشرت حسن انور ڈاکٹر	"اقبال اور مشرق و مغرب کے مفکرین"	بزمِ اقبال لاہور ۱۹۸۹ء
(۱۱) فتح محمد ملک پروفیسر	"اقبال فکر و عمل"	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۵ء
(۱۲) فضل الٰہی عارف	"متاعِ اقبال"	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۷ء
(۱۳) محمد حسن عسکری	"مجموعہ حسن عسکری"	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۴ء
(۱۴) محمد طاہر القادری	"سیرتِ اقبال"	قومی کتب خانہ لاہور طبع پنجم
(۱۵) محمد منور پروفیسر	"ایقانِ اقبال"	اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۸ء
(۱۶) محمد منور پروفیسر	"برہانِ اقبال"	اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۷ء
(۱۷) ملک حسن اختر ڈاکٹر	"اقبال اور مسلم مفکرین"	فیروز سنز ۱۹۹۳ء
(۱۸) واجد رضوی	"دانائے راز"	مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۷ء
(۱۹) وزیر آغا ڈاکٹر	"تصوراتِ عشق و خرد" اقبال کی نظر میں	اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۷ء
(۲۰) یوسف حسین خان ڈاکٹر	"روحِ اقبال"	آئینۂ ادب لاہور ۱۹۸۲ء
(۲۱) Bertrand russel.	History of western Philosophy"	Routledge London 1991

نیرنگِ خیال شمارہ اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت

لُطفِ تغزُّل در شعرِ اقبال

یا اقبال کی فارسی غزل میں تغزل کے رنگ

نوید احمد گِل

دنیا کا عام چلن یہی رہا ہے کہ اقبال کی مہانتا پر تو بہت کچھ لکھا گیا مگر اس کی "موہنتا" پر توجہ نہ دی گئی۔ اس کی انفرادیت کے تذکرے ہوئے مگر اس کی متوازیت کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے رفیع الشان فکر کی باتیں ہوئیں مگر اس کے جلیل القدر فن کو محضِ ابلاغِ فکر کا ایک مرقع قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح اس کی غزل کو بھی کنیزِ فکر بنا کر پیش کیا گیا اور غزل میں موجود تغزل کے رکھ رکھاؤ، روایتی لیے دیے رہنے کی کیفیتوں، اس کی شرمیلی باتوں اور لجائی گھاتوں کو دانستہ قلم انداز کیا گیا اور اگر کبھی نظر کی بھی تو سرسری سی، لکھا بھی تو عامیانہ سا۔ مگر اس مضمون میں اس بے التفاتی کا ازالہ کیا جائے گا۔ تغزلِ اقبال کی محفل سجائی جائے گی۔ جس میں تغزل کا تعارف، ضرورت و اہمیت، دلکش مثالیں نیز تقاضے متعین کر کے موازنے پیش کیے جائیں گے۔

تغزل کی تعریف:

علامہ شبلی کے بقول:

"ذوقی اور وجدانی چیزوں کی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔" (۱)

اور تغزل کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔

لیکن مسعود رضوی کے بقول:

"ایسی باتوں کی صرف حدود متعین کی جا سکتی ہیں وہ بھی محال کے قریب قریب۔" (۲)

اس لیے یہاں پہلے تغزل کی تعریف یعنی حدود متعین کی ہیں:

"شاعری کے عام اوصاف کے علاوہ غزل میں بعض خاص عناصر بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً نفاست، نزاکت، نکتہ سنجی، رمز و ایما، تعمیم گداز، بے ساختہ پن اور جذبوں کا سوز و گداز ان عناصر کے مجموعے کو تغزل کہتے ہیں۔" (۳)

"تغزل درحقیقت بیان کی اس دل آسا، خیال انگیز اور دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذبات درد و شوق سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شیریں، سبک اور خیال انگیز لفظوں میں خاص طور پر جلوہ گر ہوتی

ہے۔ تغزل کی لَے ایک طرف اپنے خوشگوار نالوں سے خیال کو تمنا کی خواب آلود فضاؤں سے آشنا کرتی ہے تو دوسری طرف درد انگیز نوکِ نشتر سے روح میں دھیمی دھیمی کسک اور چبھن بھی پیدا کرتی ہے۔ تغزل خیال و بیان کی ایک مجموعی کیفیت کا نام ہے کسی صنفِ سخن کا نہیں۔"(۴)

"غزل محبوب اور محبوبی کی باتوں سے پیدا ہوتی ہے۔"(۵)

یہاں اسی تعریف کو بنیاد بنا کر اقبال کی غزل میں موجود تغزل کی پرکھ کی جاتی ہے۔

اہمیت:

تغزل در غزل جانِ غزل است
غزل از بس کہ عنوانِ غزل است(۶)

(تاثیر)

"غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ غزل جسم ہے اور تغزل اُس کی روح۔ اگر غزل میں تغزل نہ ہو تو اس میں زندگی کے آثار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے غزل کے ساتھ تغزل کا خیال آتا ہے اور تغزل کے ساتھ غزل کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ غزل میں تغزل نہ ہو تو غزل باقی نہیں رہتی۔ غزل کے لیے تغزل ہی زندگی ہے کیونکہ تغزل ہی کے ہاتھوں اس میں "موجِ زندگی" رونما ہوتی ہے۔"(۷)

یافتگی:

اقبال کے کلام میں تغزل کا بڑا رچاؤ پایا جاتا ہے اس کی نشان دہی کئی ایک مشاہیر نے کی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر یوسف حسین کے بقول:

"اقبال کے یہاں بھرپور تغزل موجود ہے۔"(۸)

"غزل کی زبان اور اس کی مخصوص فضا نے اقبال کو خالص غزل (تغزل) کے شعر کہنے پر بھی مجبور کر دیا ہے مگر جب اقبال پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس میدان میں بھی حسن و لطافت کے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔"(۹)

"اقبال کے شعروں میں فکر، حکمت، اصلاح اور وعظ سب کچھ موجود ہے لیکن تغزل اس سارے ہجوم کو چیرتا، پھاڑتا یہ ہزار حسن و جلوہ سامنے آ کر ساری فضا کو اپنے حسن کے کیف میں ڈبو دیتا ہے۔"(۱۰)

تقاضے، موازنے اور کلام:

اقبال کی فارسی غزل میں تغزل کا نہایت ترقی یافتہ اور منجھا ہوا شعور پایا جاتا ہے۔ اس میں اقبال نہ صرف دوسرے شاعروں کے دوش بدوش کھڑا دکھائی دیتا ہے بلکہ اقبال تو تغزل کا روپ نکھارنے کے لیے اپنے تئیں بڑے جتن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنی دلکش جدت طرازی خوب کی ہے۔ یہاں دوسرے شعرا کے جھرمٹ میں اقبال کو بٹھا کر اس کے کلام میں موجود لطفِ تغزل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مثلاً:

"ایماں رُبائی چشمِ محبوب کا اک ادئی کرشمہ ہے۔" (۱۱)

تغزل کے اس تقاضے کو کئی ایک شعرا نے اپنے رنگ میں باندھا ہے۔ مثلاً حافظ (۷۹۱ھ) فرماتے ہیں:

به مژگانِ سیه کردی هزاران رخنه در دینم
بیا کز چشمِ بیمارت هزاران درد برچینم (۱۲-۱۳)

جبکہ نظیری (۱۰۲۱ھ) نے اسی بات کو یوں ادا کر دیا ہے:

هزار شیخ و برهمن ز کیش و دین برگشت
تصرفِ نظرِ ارجمند را چه خبر (۱۴)

اب دیکھیے اقبال اسی تقاضے کو کس خوبی سے نبھاتا ہے:

کنشت و کعبه و بت خانه و کلیسا را
هزار فتنه ازان چشمِ نیم باز آور (۱۵)

اقبال پھر ایسی ہی ایمان ستانیوں کی دعوت دیتا ہے:

بر سرِ کفر و دین فشان رحمتِ عام خویش را
بندِ نقاب بر کشا ماهِ تمامِ خویش را

"حسنِ محبوب کی زاہد فریبیاں"، یہ بھی تغزل کا محبوب موضوع ہے۔ اسے حضرت امیر خسرو (۷۲۵ھ) دیکھیے کس طرح بیان کرتے ہیں:

روزی که رَوی مست و خرامان سوی بازار
در شهر یکی صومعه آباد نه یابند (۱۶)

اسی کو حافظ یوں ادا کرتے ہیں:

بالا بلندِ عشوه گرِ سروِ نازِ من
کوتاه کرد قصهٔ زهدِ درازِ من

نظیری یہی مضمون یوں ادا کرتا ہے:

ہمیشہ راہ تو دیدم پی تو گردیدم
ز شوقِ عشقِ تو غافل شدم ز مذہبِ خویش

اقبال نے اسی بات کو ان سے قدرے بلاغت سے ادا کر دیا ہے:

بہ غارت می بری سرمایۂ تسبیح خوانان را
بہ شب خونِ دلِ زناریان ترکانہ می آئی

"اسارتِ زلف کی آرزومندی"، بھی تغزل کا بڑا پسندیدہ موضوع ہے۔ اسے اقبال نے بڑی چابکدستی سے باندھا ہے:

دام از گیسوان بہ دوش زحمتِ گلستان بری
صید چرانمی کنی طائرِ بامِ خویش را

اسی مضمون کو محی الدین عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) نے یوں کہا ہے:

فتنہ انگیز مشو کاکلِ مشکین نہ کشای
تابِ زنجیر نہ دارد دلِ دیوانۂ ما(۱۷)

اسی مضمون کو دورۂ شاہجہان کے ایک شاعر منعمی نے یوں باندھا ہے:

بہ قصد صید دلہا نازنینان
سرِ زلف پریشان دام کردند

اقبال اپنے اسی مطالبے کو ایک اچھوتے رنگ میں دہراتے ہیں:

من بندۂ بی قیدم شاید کہ گریزم پا
این طرۂ پیچان را در گردنم آویزی

"چشمِ سرگین" کی دل دو نیمیاں، بھی تغزل میں عام ملتی ہیں۔ مثلاً حافظ فرماتے ہیں:

قرار بردہ زمن آن دو سنبلِ مشکین
خراب کردہ مرا آن دو نرگسِ بیمار

یہی بات جامی یوں کہتے ہیں: المتوفی (۸۹۸ھ)

بہ ہر گوشہ کہ صد فتنہ بیدار شد
ز چشمت کہ در سرمہ خوابیدہ است

اسی بات کو اقبال نے کسی قدر جامعیت اور بلاغت سے ادا کیا:

ز نگاہِ سرمہ سائی بہ دل و جگر رسیدی
چہ نگاہِ سرمہ سائی! دو نشانہ زد بہ تیری

"دوری اور مہجوری کے شکوے بھی تغزل میں شامل ہیں۔"

چنانچہ امیر خسرو اسے یوں ادا فرماتے ہیں:

ازسرِ بالینِ من برخیز ای ناداں طبیب
دردِ مندِ عشق را دارو بہ جز دیدار نیست

تغزل کے اسی رنگ کو حافظ شیرازی نے یوں ادا کیا ہے:

ای پادشہِ خوبان داد از غمِ تنہائی
دل بی تو بہ جان آمد وقتست کہ باز آئی(۱۸)

جبکہ تغزل کے اسی انداز کو ذرا زیادہ روانی اور جولانی سے اقبال کے یہاں دیکھیے:

بہ بالینم بہ آیکدم نشین کز دردِ مہجوری
تہی پیمانۂ بزمِ ترا پیمانہ لبریز است

"مجبوروں اور مہجوروں کو ستا ستا کر لطف اندوز ہونا، محبوبِ جفا پیشہ کا پرانا شیوہ ہے اور محبوب مشغلہ ہے۔"

بقولِ حافظ:

نہ دانم از چہ سبب رنگِ آشنائی نیست
سہی قدانِ سیہ چشمِ ماہ سیمارا(۱۹)

اسی بے اعتنائی کا نظیری گلہ مند ہے:

ز دامن کہ کشایم ما تہی دستان
تو میوۂ سرِ شاخِ بلند را چہ خبر

اسی بات کو اقبال ذرا مزید سلاست سے بیان کرتے ہیں:

تو بہ جلوہ در نقابی کہ نگاہ بر نہ تابی
مہِ من! اگر نہ نالم تو بہ گو دگرچہ چارا

"عشاق کا ہمہ وقت آنکھیں فرشِ راہ کیے رہنا اور دوسری طرف سے دانستہ بے نیازی کا مظاہرہ بڑا جان گسل ہوتا ہے۔"

حافظ نے اسے یوں پیش کیا ہے:

بر آستانِ امیدتِ کشادہ ام درِ چشم
کہ یک نظر فگنی چوں فگندی از نظرم

اسی رنگ کو شریف تبریزی (۹۵۶ھ) نے ایسے ادا کیا ہے:

ز دو دیدہ خون فشاندم کہ نظر کنی، نہ کردی
بہ رہِ تو خاک گشتم کہ گذر کنی، نہ کردی(۲۰)

دیکھیے اسی رنگ کو اقبال نے بڑی سادگی سے کتنا موثر بنا دیا:

نظر بہ راہ نشینان سوارہ میگذرد
مرا بہ گیر کہ کارم ز چارہ میگذرد

"محبوبِ حقیقی اور محبوبِ مجازی کا نازک اور موثر اتصال بھی تغزل کا بڑا مروج رنگ ہے۔" اس کے اظہار میں، عاجزانہ انداز بزرگ شعرا کا وطیرہ رہا۔ مثلاً خواجہ حافظ نے کہا ہے:

ای غایب از نظر کہ بہ خدای سپارت
جانم بہ سوختیٔ و بہ جان دوستدار مت

جبکہ نظیری نے ایسے کہا ہے:

ز شانِ حسنِ تو نہ توان نشان گفتن معاذاللہ
تو در دانش نمی گنجی و در بینش نمی آئی

لیکن اقبال تو آمد محسوس کرتا ہے:

در موجِ صبا پنہاں دز دیدہ بہ باغ آئی
در بوی گل آمیزی باغنچہ در آویزی(۲۱)

پھر نظیری بڑی تیزی سے سوال کرتا ہے:

ز یار و محرم را گزرنی صبر و راحت را سفر
آخر درین ویرانۂ دل تنہا چسان جا کر دہ؟

اقبال قدرے نزاکت سے اس کا جواب دیتا ہے:

نہ تواندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سوئی مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی

اب تو نظیری بھی مان جاتے ہیں کہ:

رسوا منم وگرنہ توصد بار در دلم
رفتی و آمدی و کسی را خبر نہ شد

لیکن اقبال کا فن وضاحتوں سے بھرپور نزاکتوں کا فن ہے۔ "محبوب کی برقِ نگاہ سے اپنے خرمنِ حیات کو خاکستر کر لینے کی آرزو کس عاشق کو نہ ہو گی۔"

تغزل کے اس تقاضے کو حافظ یوں ادا کرتے ہیں:

دارد دلِ درویش تمنائی نگاہی
زان چشمِ سیہ مست بہ یک غمزہ رواکن

جبکہ اقبال اسی برق نگاہ کے شدید آرزومند رہے:

کجاست برقِ نگاہ کہ خانمان سوزد
مرا معاملہ بار کشت و حاصل است ہنوز

"تغزل کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے بقولِ حسرت موہانی:

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا(۲۲)

تغزل کے اس تقاضے کو حافظ یوں ادا فرماتے ہیں:

ترا می بینم و میلم زیادت میشود ہر دم
مرا می بینی و ہر دم زیادت می کنی در دم

اسی رنگ کو نظیری یوں سناتا ہے:

مجنوں نشد آرام پذیر از رُخِ لیلیٰ
درد یست جدائی کہ بہ درماں نہ رسیدہ

اس رنگ کو اقبال نے یوں جدت ادا سے ادا کیا ہے:

نگاہِ شوق تسلی بہ جلوہ نہ شود
کجا برم خلشی را کہ درد دل است ہنوز

"خمریات اردو اور فارسی تغزل کا بڑا اہم موضوع ہے مگر لے دے کے "چشمِ ساقی" ہی سارا مے خانہ قرار پاتی ہے۔"
سَرُور بارہ بنکوی نے اسے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے:

کہہ گئی مجھ سے راز دارانہ
چشمِ ساقی رموزِ مے خانہ(۲۳)

اسی مفہوم کو کلیم کاشانی (۱۰۶۱ھ) نے یوں جدت سے ادا کیا:

شکرِ چشم تو کند محتسب شہر کزو
ہر کجا میکدہ ہست خراب افتادہ است(۲۴)

محبوب کی بدمست نگاہوں کا ذکر اقبال نے بھی کیا ہے اور اس خوبی سے کیا ہے کہ شعر بجائے خود سہل ممتنع کا ایک دلکش مرقع بن گیا ہے:

از چشمِ ساقی مستِ شرابم
بی مَیَ خرابم بی مَیَ خرابم

"محبوب کے گیسوانِ خم بہ خم میں عشاق کی شدید آرزوئے اسارت" یہ بھی غزل کا اہم موضوع ہے، جیسا کہ خواجہ شیراز فرماتے ہیں:

اگر از تو یک سرِ مُوسر کشدَ حافظ
بگیر و در خم زلفش بہ پیچ و تاب انداز

اقبال تو محبوب کو بڑی آسان سی ترکیب بتاتے ہیں: مثلاً

فرصت کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئی تابدار را

"سچی محبت اپنے اثبات کے لیے لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔"

تغزل کا ایک یہ رنگ خان خانان (۹۶۶ھ) سے یوں بڑی سلاست و جامعیت سے ادا ہوا:

بہ کیش صدق و صفا حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است(۲۵)

اقبال نے اسی رنگ کو ذرا وضاحت عطا کر دی:

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سو گندِ دگر

"محبوب کو دیدار اور پھر بار بار دیدار کے لیے مختلف ایمائی حیلے بہانوں سے اکسانا بھی تغزل کا اہم مضمون ہے۔" مثلاً حافظ کہتے ہیں:

گرلاف زند ماہ کہ ماند بہ جمالت
بہ نمائی رخِ خویشِ مہ انگشت نما کن

دیکھیے اقبال نے اسی مفہوم کو کس سلاست سے ادا کر دیا ہے:

چند بہ روی خود کشی پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

"گیسوان برہم سے مستقل وابستگی مزاجوں اور حواسوں کی ہمہ وقتی درہمی کا باعث بنتی ہے جس سے ایک ژولیدہ فکری پیدا ہوتی ہے۔" کیسے کہ بقولِ نظیری:

شرحِ سودائی دلم را سر و سامان مطلب
کار آنست کہ چون زلفِ تو درہم باشد

جبکہ ایک نہایت بزرگ شاعر امیرِ معزّی (۵۲۰ھ) نے اس رنگ کو یوں ادا کیا تھا:

دلِ بے‌قرار دارم از آن زلفِ بے‌قرار
سرِ پُر خمار دارم از آن چشمِ پُرخمار(۲۶)

دیکھیے اسی مضمون کو اقبال نے قدرے معقول کر دیا:

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوئی او پریشان گفت

"فتراک زیبیٔ محبوب بھی عشاق کے لیے کسی سعادتِ عظمیٰ سے کم نہیں ہوتی۔" اس کو نظیری کس ندرت سے کہتے ہیں:

شکارت خوش بر آید گر خود از منزل بیرون آئی
نگاہت جانب مرغ مبارک فالِ من اُفتد

لیکن اقبال کی جدت زیادہ واضح اور معقول ہے:

تپید یک دم و کردند زیب فتراکش
خوشا نصیب غزالی کہ زخمِ او کاریست

"تغزل میں نشۂ شباب میں چور محبوبوں کی بے نیازیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔" حافظ فرماتے ہیں:

ہزار بار مرا آشناؤ دیگر بار
مرا بہ بیند و گوید کہ این چہ کس باشد

جبکہ بیدل اسی بے نیازی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ المتوفی (۱۱۳۳ھ):

بہ ہر کجا ناز سر بر آرد نیاز ہم پائی کم ندارد
تو و خرامی و صد تغافل من و نگاہی و صد تمنا(۲۷)

اقبال نے اسی رنگ کو بڑی خوبی اور جامعیت سے نبھایا ہے:

من چشم نہ بردارم ازروئی نگارینش
آن مستِ تغافل را توفیقِ نگاہی نیست

"تغزل میں عاشقانِ صادق معشوقِ ستم طراز کو دعائیں دیتے نہیں تھکتے" اس مضمون کو حافظِ شیریں سخن یوں عطا کرتے ہیں:

ناوکِ چشم تو در ہر گوشہ
ہمچو من افتادہ دارد صد قتیل

جبکہ نعمت خان عالی (۱۱۲۱ھ) نے حافظ سے کچھ واضح تر کر دیا:

آن بیوفا کہ آمد و یکدم نشست و رفت
پُرسید دل کجاست؟ بہ گفتم شکست و رفت(۲۸)

اسی بات کو اقبال یوں ادا کرتے ہیں:

از ما بہ گو سلامی آن ترکِ تند خورا
کہ آتش ز داز نگاہی یک شہرِ آرزو را

"تغزل میں دنیا کی زود رَوی کو محبوب کی بے وفائی کے رنگ میں ادا کیا جاتا ہے اور ساتھ درازیٔ عمر کی دعائیں بھی دی جاتی ہیں۔" مثلاً حافظ فرماتے ہیں کہ:

فکر بلبل ہمہ آن است کہ گل شد یارش
گل در اندیشہ کہ چون عشوہ کند درکارش

جبکہ نظیری اس میں مزید ایمائیت بھر دیتے ہیں:

گفتند کم بہ قامت سمن، عندلیب گفت
ای کاش عمرِ گل بہ حیاتِ سمن رَسد

اقبال نے ایک بالکل اچھوتی ترکیب سے اس کی نشتریت میں کئی گناہ اضافہ کر دیا ہے:

ای بلبل از وفایش صد بار با تو گفتم
تو در کنار گیری باز این رمیدہ بو، را

"تغزل میں ستمِ محبوب کی شکایت ہوتی ہے لیکن برنگِ رغبت نہ کہ برنگِ طنز"۔ اسی مضمون کو خسرو نے کہا ہے:

از بس کہ گرفتارِ غمت شُد ہمہ دلہا
آفاق بہ گردند و دلی شاد نہ یابد(۲۹)

جبکہ اقبال نے اپنی نو کشف خیالی تشبیہات اور استفہامیہ رنگ میں بڑی خوبی سے ادا کیا:

این کیست؟ بردل ہا آوردہ شب خونی
صد شہر تمنا را یغماز دی ترکانہ

"دربارِ محبوبی میں عجز ہی متاع معتبر ہے۔"
تغزل کی اس صورت کا اظہار حافظ نے ایسے کیا ہے:

در کوئی عشق شوکت شاہی نمی خرند
اِقرارِ بندگی کن و دعوائِ چاکری

اس خیال کو نظیری نے ایسے باندھا ہے:

نیاز شیوہ ماعاجزانِ محتاج است
ترا کہ حسن و جمال است بی نیازی بَس

مگر اقبال نے تو اسی کو ایک ضابطہ بنا دیا ہے:

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند
ہمین بس است کہ آئینِ چاکری داند

"تغزل میں معشوق کے ان لبِ لعلین کا ذکر ہوتا ہے جو بڑے بڑوں کو بدمست بنا دیتے ہیں۔" مثلاً حافظ فرماتے ہیں:

غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدار انند
خراب بادۂ لعلِ تو ہشیار انند

نظیری اس کا پتا پُرزور بلاغت میں یوں دیتا ہے:

نہ کنم یاد لبِ بادہ فروشش بہ نماز
کہ ز مسجد بہ خرابات خرابم نہ بُرَد

جبکہ اقبال اس مضمون کو ایک گونا آفاقی بنا دیتے ہیں:

سرخوش از بادہ تو خم شکنی نیست کہ نیست
مستِ لعلینِ تو شیرین سخنی نیست کہ نیست

"تغزل میں محبوب کی اُس سادگی جاں ستاں کا ذکر ہوتا ہے جو ہزاروں ہوشیاریوں پر بھاری اور سیکڑوں پُرکاریوں پر حاوی ہوتی ہے۔" جیسے کہ نظیری نے کہا ہے:

اگر حسن فروشان بہ جلوہ آمدہ اند
کسی بہ حسن و ملاحت بہ یارِ مانہ رسد

جبکہ نظیر اکبر آبادی (۱۸۳۰ھ) محبوب کی پُرکاری کا ذکر یوں کرتا ہے:

دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بے کل
پری رُو، تندخو، سرکش، ہٹیلا، چُلبُلا، چنچل (۳۰)

اقبال بھی محبوب کی ایسی ہی سادگی کی مداحی یوں کرتا ہے:

نگارِ من کہ بسی سادہ و کم آمیز است
ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

"دیدہ و دانستہ خسارے کے سودے پر راضی ہو جانا صرف عشاق کا شیوہ ہے دوسروں کو اس کا یارا کہاں۔" خان خاناں کہتا ہے:

مرا فروخت محبت ولی نہ دانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است (۳۱)

اس رنگ کو اقبال ذرا سی سلاست سے بڑا آگے لے گئے ہیں:

ہمہ سرمایۂ خود را بہ نگاہی بہ دہند
این چہ قومی است کہ سودا بہ زیان نیز کنند

اقبال نے نازوروں اور ناز بروں میں ہونے والی اداؤں بھری پُرلطف آویزش کا تذکرہ بڑی فنی باریک بینی سے کیا ہے:

ز ستیزِ آشنایان چہ نیاز و ناز خیزد
دلکی بہانہ سوزی نگہی بہانہ سازی

اقبال نے تغزل میں تشنۂ دیدار نگاہوں کی عکاسی بھی بڑے مکمل اور مؤثر پیرایہ میں کی ہے:

حسرتِ جلوۂ آن ماہِ تمامی دارم
دست بر سینہ، نظر برلبِ بامی دارم

"نگاہِ ناز کو اس کی دل ربائیوں پر درازیٔ عمر کی دعائیں دینا۔" سچے عاشقوں کا پرانا شیوہ ہے۔ اقبال بھی یہی کہتے ہیں:

کو آں نگاہِ ناز کہ اوّل دلم ربود
عمرت دراز باد ہمان تیرم آرزوست

"تغزل میں محبوب کے اس تغافل کی شکر گزاریاں بیان ہوتی ہیں جو عشاق کے لیے جلوہ درزدی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔" اقبال نے اس رنگ کو بڑی سلاست اور چاہت سے بیان کیا ہے:

تغافلے کہ مرا رخصت تماشا داد
تغافل است و بہ از التفات دمبدم است

"یہی وہ شعریت ہے یہی وہ تغزل، جس نے ہر دور میں اقبال کے شعر کو تختِ ذہن پر متمکن کرنے کی بجائے خانۂ دل میں جگہ دی کہ تغزل کو یہی گوشۂ عافیت محبوب ہے۔" (۳۲)

حرف آخر:

مختصر یہ کہ فارسی غزل اقبال کے پاس کنیا سے کامنی بن کر آئی اقبال نے اپنے خونِ جگر کی سرخی، گرمی اور شوخی سے اس کی نگار گری کی۔ اپنے فن کے کامل رچاؤ سے اس کی حنا بندی کر کے اس کی مانگ میں نرملا، کومکتا اور چنچلتا کا وہ من موہک سندور بھرا کہ اس کو کامنی سے رانی روپ متی بنا ڈالا۔ اور اقبال کا یہی رنگِ تغزل پاک و ہند میں پروان چڑھنے والے فارسی ادب میں آج تک معیاری غزل بھی ہے اور معیارِ تغزل بھی۔

حواشی:

(۱) شعر العجم، جلد چہارم۔ علامہ شبلی نعمانی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، انارکلی لاہور۔ ۱۹۶۶ء۔

(۲) ہماری شاعری، مسعود رضوی ادیب، نذر سنز اردو بازار، لاہور ۱۹۸۷ء۔
(۳) فن و ادب عروض، پروفیسر علی حسن چوہان، الائیڈ بک سینٹر لاہور، ۱۹۹۰ء۔
(۴) مباحث، سید عبداللہ مرحوم۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۵ء۔
(۵) "مطالعہ اقبال" مقالہ سید وقار عظیم، بزم اقبال جدید پریس، لاہور۔ ۱۹۸۳ء۔
(۶) شعر صدیق تاثیر کلام غیر مطبوعہ۔
(۷) غزل اور مطالعہ غزل، عبادت بریلوی، انجمن ترقی اردو پریس، کراچی ۱۹۸۸ء۔
(۸) اقبال کی فارسی غزل، منور مرزا۔ ایوان اردو سینٹرل پریس، کراچی ۱۹۷۷ء۔
(۹) اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر شکور احسن مطبع عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء۔
(۱۰) مطالعہ اقبال از مقالہ سید وقار عظیم بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء۔
(۱۱) فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر ریاض اور صدیق شبلی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء، تمام تاریخ وفات کا، آخذ۔
(۱۲) "دیوان حافظ" فیضی کتب خانہ۔ کالسی روڈ نزد حاجی یمینی روڈ، کوئٹہ ۱۹۰۴ء۔
(۱۳) دیوان نظیری، شیخ مبارک تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ، لاہور۔ ۱۹۲۷ء۔
(۱۴) زبور عجم از اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز چوک انار کلی بند روڈ لاہور، ۱۹۷۰ء۔
(۱۵) انتخاب کلام خسرو دو جلد، مرتبہ محمد عثمان، آصف فکرت بیہقی پبلیشرز کابل افغانستان، ۱۹۷۵ء۔
(۱۶) "فارسی غزل کا ارتقا"، ظہیری صدیقی، مجلس تحقیق و تخلیق، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۳ء۔
(۱۷) ایضاً ص ۳۶۶۔
(۱۸) ایضاً ص ۱۷۱۔
(۱۹) ایضاً ص ۳۳۵۔
(۲۰) ایضاً ص ۳۳۰۔
(۲۱) "مسیٰ باقی" از علامہ اقبال، احسن برادرز، لاہور۔ ۱۹۴۸ء۔
(۲۲) دیوان حسرت موہانی، مرتبہ فرحت صبا، خیام پبلی فرز لاہر۔
(۲۳) "اقبال اور دوسرے شعرا"، خواجہ منظور حسین۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۷۷ء۔
(۲۴) شعر العجم جلد سوم۔ علامہ شبلی عشرت پبلشنگ ہاوس، لاہور ۱۹۶۶ء۔
(۲۵) فارسی غزل کا ارتقا از ظہیر صدیقی۔ حوالہ۔ ۱۶ ص ۱۳۴۔
(۲۶) ایضاً ص ۲۸۷۔
(۲۷) دیوان بیدل دہلوی ناشر کتب فروشی فروغی باہتمام حسین آہی ایران، ۱۳۷۱ھ۔
(۲۸) فارسی غزل کا ارتقا، حوالہ بمطابق حوالہ نمبر ۱۶۔
(۲۹) "انتخاب کلام خسرو"، کابل افغانستان۔ ۱۹۷۵ء۔
(۳۰) "اردو کی مختصر ترین تاریخ"، سلیم اختر ڈاکٹر، سنگ میل لاہور، ۱۹۸۶ء۔
(۳۱) فارسی غزل کا ارتقا، ص ۱۳۴۔
(۳۲) مطالعہ اقبال مقالہ وقار عظیم، بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۸۳ء۔

اقبالیات

اقبال شناسی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین

پروفیسر شفیق عجمی
شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

اقبال شناسی کی عالمی روایت کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبال کے نظریہ کی اساس پر قائم ہونے والی مملکت پاکستان کے علاوہ صدی رواں کے دوران برِصغیر کے دوسرے حصوں خصوصاً بھارت، مغرب میں انگلستان، اٹلی، جرمنی، فرانس، چیکوسلواکیہ اور امریکہ نے اور روس کے علاوہ وسطی ایشیائی ریاستوں میں اقبال کی شاعری اور فکر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اقبال ان ممالک میں محض ایک علمی حوالے کی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ برِصغیر کی آزادی کے لیے کی جانے والی طویل جدوجہد میں اپنی فکری و عملی کاوشوں کے لحاظ سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

مشرق و مغرب کے اہم اقبال شناسوں کی طویل فہرست میں ایک اہم نام ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا بھی ہے جنھوں نے بالخصوص اپنی تصنیف "حکمت اقبال" میں اقبال کے فلسفہ خودی کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۹۶۹ء میں "حکمت اقبال" کی اشاعت کے بعد ایک بحث میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے "حکمت اقبال" کو ایک جداگانہ علمی بلکہ فلسفیانہ حیثیت کی حامل تصنیف قرار دیا جس کی اہم ترین خصوصیات نکتہ طرازی اور خیالات کی گہرائی کی بدولت اسے اقبال پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں یعنی "روحِ اقبال" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) "فکرِ اقبال" (خلیفہ عبدالحکیم)، "اقبال اور جمالیات" (ڈاکٹر نصیر احمد نصیر) اور "اقبال۔ نئی تشکیل" (عریز احمد) میں شمار کیا جاسکتا ہے۔(۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کی نظر اقبال شناسی پر گہری ہے اور اقبالیات کے حوالے سے وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف و مولف بھی ہیں۔ "حکمت اقبال" کو اگر انھوں نے چند بہترین کتابوں میں سے ایک قرار دیا ہے تو اس کی وجہ اقبال اور فکرِ اقبال کے ساتھ ڈاکٹر رفیع کی سچی وابستگی ہی ہے۔ اس لیے کہ کسی کتاب کی علمی قدر و قیمت کے تعین کے لیے کتاب کے ساتھ ساتھ صاحبِ کتاب کی اسی کیفیت کا مطالعہ بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے جس کے تحت وہ کتاب لکھنے کی طرف مائل ہوا۔

اقبال پر لکھی گئی بیشتر تصانیف کی عام کیفیت یہ ہے کہ چند مرغوب موضوعات کی بے جا اور بے مزا تکرار سے ہٹ کر سوچنے اور لکھنے سے گریز کیا جاتا رہا ہے۔ بیشتر لکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ فکرِ اقبال کے کسی ایک پہلو سے متاثر (یا متعصب) ہو کر اس کو موضوع بنا لیا جاتا ہے اور باقی افکار سے اعتنا کی صورت روا نہیں رکھی جاتی۔ اقبال کی مجموعی فکر کی روشنی میں اس کے تصورات کی تفہیم

کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے طے شدہ نظریات اور نتائج کی تصدیق اور تطبیق کے لیے اقبال کی فکر کے کسی ایک پہلو کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اقبالیاتی تحقیق کی ایک قسم پیشہ ورانہ ضرورتوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ یقیناً ایسی تحقیق "روحِ تحقیق" سے معرا رہتی ہے کیونکہ "محقق" اس کیفیت سے دوچار ہوئے بغیر تحقیقی مراحل طے کرتا ہے جو اعلیٰ قدر و قیمت کے اندازے کے لیے اسے مذکورہ کسوٹی پر پرکھنا بھی ضروری ہے۔ اسی صورت میں اسے اقبال پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں شمار کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی نتیجہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی زندگی کے مطالعہ سے ان کی اقبال کے ساتھ بھی وابستگی اور والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے راقم کو ذاتی طور پر ڈاکٹر مرحوم کے بعض قریبی رفقا سے ان کے بارے میں گفتگو کے مواقع میسر آئے ہیں جن میں بار بار یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر رفیع الدین کی زباں پر اقبال کا ذکر رہتا ہے۔ وہ اسلام کو بھی اقبال کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال اور اسلام ان کی زندگی کے محبوب موضوعات ہیں بلکہ مقاصدِ حیات ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر مرحوم اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اسی کے ورد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی ان کی نظر میں اسلام کی حکیمانہ توجیہ کا درجہ رکھتا ہے اور خود جو کچھ انھوں نے زندگی میں لکھا ہے وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی ہی تشریح و تفسیر ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا یا اسلام کا مطالعہ ایک خالص اور منظم فلسفہ یا سائنس کے طور پر "Ideology of the Future" میں پیش کیا گیا ہے۔ فلسفۂ خودی کو فلسفۂ اسلام کے طور پر "قرآن اور علم جدید" میں بیان کیا گیا ہے جبکہ فلسفۂ خودی فکرِ اقبال کی روشنی میں اقبال کے حوالوں کے ساتھ "حکمتِ اقبال" میں موجود ہے۔ (۲)

ڈاکٹر رفیع الدین کو بعض معاصرین ان کی وقیع علمی تصانیف کے اعتراف میں اقبالؔ کے بعد اہم مفکر قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر رفیع الدین اپنے فلسفہ کو طبع زاد قرار دینے کی بجائے اسے فلسفۂ اقبال کی تشریح اور خود کو اقبال کے شارح اور مفسر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی اقبال شناسی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اقبال کے بارے میں شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر یا پھر فلسفی یا متکلم کی بحث میں الجھے بغیر اس کے تصورات کو عقلی اور منطقی ترتیب و تنظیم کی بنیاد پر ایک نظامِ حکمت قرار دیا ہے جس کا مطالعہ ایک کل یا وحدت کی حیثیت میں کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر مرحوم کے نزدیک اقبال کے تصورات کے بارے میں جس قدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جس قدر مباحثے یا اختلافات موجود ہیں جس قدر نادانستہ طور پر اپنے اپنے خیالات کی تائید میں استعمال کرنے کی غلط کوششیں کی جارہی ہیں اور ان کے مفہوم کے اندر تضادات کے شبہات پیدا کیے جارہے ہیں ان سب کا باعث یہی ہے کہ انھوں نے اس اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ (۳)

ڈاکٹر رفیع الدین اقبالؔ کے تصور خودی کو اقبال کے نظامِ حکمت کا مرکز قرار دیتے ہیں اور پھر اسے اپنے تصور وحدت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال اور دوسرے فلسفیوں میں فرق یہ ہے کہ اقبالؔ کے نزدیک جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کائنات کی وحدت کا اصول یا حقیقت کائنات جو کائنات کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے حق تعالیٰ کا وجود ہے۔ (۴)

انہی اصولوں کی روشنی میں ڈاکٹر رفیع الدین نے خودی، اس کی حقیقت، اس کے اوصاف اور مختلف پہلوؤں کو الگ الگ عنوانات مثلاً خودی اور تخلیق، خودی اور فلسفہ اور فلسفۂ تاریخ، خودی اور رحمۃ للعالمین، خودی اور عقل، خودی اور سائنس اور خودی اور سوشلزم وغیرہ کے تحت اس مدلل، مربوط اور علمی انداز میں پیش کیا ہے کہ "حکمتِ اقبال" نہ صرف یہ کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی

ایک منفرد تشریح کا درجہ حاصل کرلیتی ہے بلکہ بعض خصوصیات کی بنا پر اس کا شمار اقبال پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی اقبال شناسی کا ایک ممتاز پہلو یہ بھی ہے کہ دیگر شارحین اقبال کی مانند ان کی نظر میں اقبال کا فلسفہ "خودی" محض مجرد تصور نہیں بلکہ ایسا عملی نظریہ ہے جس کی بنیاد پر دنیا میں ایک نظریاتی ریاست کا ظہور ہوا۔ اس لحاظ سے فلسفہ "خودی" مملکت پاکستان کا فلسفہ، نظریہ اور ترجمان قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اقبال کے فلسفہ "خودی" کی منظم تشریح و توسیع کرتے ہوئے اسے جس عملی انطباق سے ہمکنار کرتے ہیں اس علمی سعی کی بدولت اقبال شناسی کی روایت میں ان کو ایک اہم مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) ماہنامہ "کتاب"، لاہور۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی اگست، ۱۹۷۰ء، ص ۳۲۔
(۲) رفیع الدین، ڈاکٹر محمد۔ دیباچہ "حکمتِ اقبال"، علمی کتاب خانہ لاہور۔
(۳) ایضاً ص ۲
(۴) ایضاً ص ۸

اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان

از

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

یہ کتاب اُردو کے حوالے سے قومی یکجہتی پر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔
جسے اُردو کے مزاج شناس اور ممتاز نقاد و محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے
بڑی محنت، چھان بین اور مستند حوالوں سے لکھا ہے

قیمت=/۶۰ روپے

شائع کردہ
انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

علامہ اقبال اور سر راس مسعود

پروفیسر فتح خان ملک

اقبال ممدوحِ عالم ہیں۔ ان کی شہرت اکناف و اطرافِ عالم میں پھیل رہی ہے۔ اس کے دلاویز نغمے دلوں میں رس گھولتے ہیں۔ اس کی شاعری نے اسلامیانِ ہند کی بیداری میں گراں قدر کردار ادا کیا۔ اقبال نے اتحادِ عالمِ اسلام کے لیے انتھک کوشش کی۔ شیخ نور محمد کے اس فرزندِ ارجمند نے دلوں کو حریم کبریا سے آشنا کیا اور پوری دردمندی و دلسوزی سے اُمتِ مسلمہ کی بیداری میں حصہ لیا۔ اقبال کی علی گڑھ سے گہری وابستگی تھی۔ سر سید احمد خان سے اقبال کی عقیدت کا مظہر ان کی نظم "سید کی لوحِ تربت" ہے۔ برِصغیر کے تمام عمائدینِ ملت سے اقبال کے تعلقات تھے لیکن خانوادۂ سر سید سے اقبال کو عشق تھا۔ سر سید احمد خان کی شخصیت میں بڑی صفات تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اوصافِ حمیدہ سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت مقنن، مفسر، عالمِ دین، بے مثل ادیب، قادرالکلام شاعر، نڈر خطیب، پرجوش مبلغ، سچے ریفارمر اور صلح کل انسان تھے۔

سر سید احمد خاں کے دو بیٹے تھے۔ سید حامد اور سید محمود، سید حامد ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے انڈین پولیس سروس میں ملازمت اختیار کی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز یہ بانکا، سجیلا، جوانِ رعنا ۱۸۹۳ء میں بیمار ہوا اور مختصر سی علالت کے بعد زندگی کی بازی ہار گیا۔ سر سید احمد اس صدمے سے بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔

سید محمود ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد ۳۲ سال کی عمر میں انھیں الہ آباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں نوعمری میں یہ منصبِ جلیلہ ملا۔ سید محمود بہت بڑے عالم، نامور قانون دان اور فقہِ اسلامی کے ماہر تھے۔ شعر کے اچھے پارکھ تھے۔

انھوں نے فقہِ اسلامی کی مشہور کتب "کتاب الطلاق" اور "کتاب الشفعہ" کے اردو تراجم ۱۸۹۷ء میں شائع کیے۔ برِصغیر کے قانونِ شہادت کے بارے میں معرکتہ الآرا کتاب "شرح قانونِ شہادت مجریہ ہند" علی گڑھ سے چھاپی تھی۔

سید محمود اور سید حامد سر سید کی شاخ کے دو خوش رنگ پھول تھے، لیکن خانوادۂ سر سید کا گلِ سرسبد سر راس مسعود کو کہا جاتا ہے۔ شہرت اور عظمت ان کا مقدر بنی۔ راس مسعود سید محمود کے اکلوتے بیٹے تھے۔ سر سید کو اپنے اس ہونہار پوتے سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا اور مسعود کی رسم بسم اللہ پر پانچ صد روپے کی تھیلی اس کی گود میں رکھ دی تھی۔ سر سید کے بے تکلف دوست اور ہمدرد و محسن مہاراجہ جے کشن داس نے راس مسعود سے پوچھا کہ تم ان روپوں کا کیا کرو گے؟ تو انھوں نے بے ساختہ جواب دیا کہ دادا جان کے کالج کو دوں گا۔ ایک معصوم بچے کی زبان سے ایثار والا کلمہ سن کر اہلِ مجلس نے بھی خاصی رقم کالج فنڈ کی نذر کی تھی۔ (۱)

راس مسعود کی تعلیم و تربیت میں ان کی شفیق والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ عربی ان کی مادری زبان تھی فارسی اور اردو میں بھی انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ روایت ہے کہ سر سید مرحوم کو جس محاورے کی صحت پر شک ہوتا یا سند درکار ہوتی تو وہ اپنی بہو سے دریافت فرماتے تھے۔(۲)

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد راس مسعود اعلیٰ تعلیم کے لیے عازمِ انگلستان ہوئے۔ علی گڑھ کے جن نامور اساتذہ سے راس مسعود نے کسبِ فیض حاصل کیا۔ ان میں ماریسن صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے سید محمود دخترِ رز کے رسیا تھے اور عالم مدہوشی میں انھوں نے مسعود کو موسمِ سرما کی سخت سرد رات کو باغیچے میں لا کھڑا کیا اور انھیں کاشتکاری کے فضائل پر لیکچر دینا شروع کیا۔ راس مسعود پاسِ ادب سے کھڑے کافی دیر تک یہ وعظ سنتے رہے۔ ان کی والدہ نے کسی طرح ماریسن صاحب کو خبر کی۔ انھوں نے آ کر سید محمود کو سمجھا بجھا کر اپنے ہمراہ لیا اور یوں راس مسعود کی جاں بخشی ہوئی۔(۳)

علامہ اقبال کی طرح راس مسعود بھی اپنے اساتذہ کے قدردان اور فرمانبردار تھے۔ بچپن میں انھوں نے ایک نابینا حافظ صاحب سے قرآنِ پاک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ولایت سے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ایک دن یونیورسٹی کے معائنے سے فارغ ہو کر انھوں نے اپنے استادِ مکرم نابینا حافظ صاحب کے درِ دولت پر حاضری دی۔ حافظ صاحب تنہا رہتے تھے انھیں غسل کے لیے دوسرے آدمی کی حاجت ہوتی تھی۔ انھوں نے راس مسعود سے اس معصوم خواہش کا اظہار کیا۔ یونیورسٹی کے عمائدین راس مسعود کے ہم رکاب تھے۔ انھوں نے ذاتی وجاہت اور عالمانہ مرتبے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کوٹ کی آستینیں چڑھائیں اور خوب صابن مل مل کر اپنے استاد کو نہلایا۔(۴)

علم دوستی اور استاد نوازی راس مسعود کا ساری عمر شعار رہا۔ علامہ اقبال ۱۹۰۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے بعد وطن واپس آئے۔ راس مسعود نے ۱۹۰۹ء میں لنکن اِن سے تاریخ میں بی۔اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اقبال اور راس مسعود کی انگلستان میں ملاقاتیں رہیں اور ان کی یہ دوستی مرتے دم تک برقرار رہی۔ راس مسعود نے اقبال سے عقیدت کا اظہار "انتخابِ زریں" کی صورت میں پیش کیا۔ اردو شعرا کے کلام کا یہ مجموعہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اور اس میں سب سے زیادہ منظومات علامہ اقبال کی شامل ہیں۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کا کوئی اردو مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے اقبال کی شاعری اور حیات و خدمات کے بارے میں جو سوانحی نوٹ رقم کیا ہے۔ اس کی ایک ایک سطر سے خلوص ٹپکتا ہے(۵) راس مسعود کی وائس چانسلری کے زمانے میں علامہ اقبال نے علی گڑھ کے علمی و ادبی حلقوں سے خطاب کیا اور اپنے مشہور زمانہ خطبات ارشاد فرمائے۔ یہ لیکچر اقبال کی فلسفیانہ ژرف نگاہی اور عالمانہ فکر کا شاہکار ہیں۔ راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو علی گڑھ میں پروفیسر امریطس مقرر کریں لیکن اقبال کے فقرِ غیور اور ست کوشی نے اسے قبول نہ کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی فیضانِ اقبال سے محروم رہی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے مستعفی ہو کر راس مسعود ریاست بھوپال میں وزیرِ تعمیرات مقرر ہوئے تو انھوں نے اقبال کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور برقی شعاعوں سے گلے کا علاج کرانے کی پیشکش کی۔ راس مسعود اور ان کی اہلیہ محترمہ نے اقبال کی مہمانی اور قدردانی کا حق ادا کیا اور اقبال کی تنگدستی کے زمانے میں نواب بھوپال سے پانچ سو روپے کی خطیر رقم بطور وظیفہ منظور فرمائی امتِ مسلمہ کے اس عظیم فلسفی، دانشور اور حکیم الامت کو فکر معاش سے نجات دلانے میں اور غمِ روزگار سے چھٹکارا دلانے میں راس مسعود کا بڑا ہاتھ تھا۔ راس مسعود ایک عمدہ مقرر، صاحبِ ذوق انسان اور فنِ شعر کے بڑے نباض تھے۔ انھوں نے اقبال کی کچھ منظومات کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ جو نذرِ قارئین ہے۔

اقبال کی نظم کے ان اشعار کو راس مسعود نے انگریزی ترجمے کا روپ عطا کیا ہے۔

قصد کس محفل کا ہے؟ آیا ہے کس محفل سے تو(۶)
زرد رُو شاید ہوا رنج رہِ منزل سے دور
گھر بنایا تو نے گو ہنگامہ ہستی سے دور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور
ہاں اُتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی

But whence hast thou come, moon
And whither doest go?
the pains of thy journey
Thy pallor doth show.
Apart from earth's tumult
though dwelling in space
Thy rays are no strangers
In homes of our race
Ah, enter this bosom
And bring me light.
That thus for an instant
My darkness be bright(7)

راس مسعود کلامِ اقبال کے شیدائی بلکہ عاشق تھے۔ وہ اردو شاعری کے رسیا تھے اور تنہائی میں عمدہ اشعار گنگنایا کرتے تھے۔ انھوں نے میر انیس کی رباعیات کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا اور مراثی انیس کے انگریزی میں منظوم ترجمے کیے اقبال کا تقریباً سارا کلام انھیں ازبر تھا۔ اقبال کی ایک معروف نظم ایک آرزو کو کس خوبصورتی سے انگریزی ترجمے کا حسن عطا کیا ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتا ہے میرا(۸)
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا مجھ کو جامِ جہاں نما ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی موذن
مَیں اس کا ہم نوا ہوں، وہ میری ہم نوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بےہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

"بانگِ درا"، ص ۴۷، ۴۸ پر اس نظم کے اشعار کی ترتیب میں ردّوبدل ہے اور پانچ اشعار کا اضافہ ہے اور کچھ اشعار قلمزد بھی ہیں۔ "باقیاتِ اقبال"، صفحہ ۳۰۰ پر اس نظم کے دس اشعار درج ہیں۔ جو "مخزن" کے شمارہ مطبوعہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے

تھے۔ یہ اشعار "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت حذف کر دیے گئے۔ مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

A Prayer
Sated lord! am I and worried
With this worldly throng and press.
when the heart its fire that quenched,
What of joy can crowd possess.
How I yearn to flee the turmoil!
Tis for silence that I crave ,
Silence such that its enchantment
swift world speech it self enslave.
Tis for stillness I Can Pinning.
And my prayer is this alone.
On the skirt of some far mountain
Just a hut of leaves to own.
I would have the joys of singing
In the songs the birdlets sing
I would have, for all my music
But the babbling of a spring.
In the lap of earth a slumber
Let the verdant grasses lie
Let the Wending, wending waters
Neath the bushes, sparkle by!
give me tidings of my friends
Like a tiny cup of Jamshid
Showing forth earth's farthest ends.
Let the green shrubs and bushes
Range in ranks on either side
While their likeness are taken
By the river's crystal tide.
Let the mountain's glorious land scape
Be so full of charm and grace.
that the streams, in wanes uprising
Shall aspire to view its face.
when the westing sun with henna
Shall adorn the bride of night.
Let the flowerest, ruddy tunics,
gleam again with golden light.
when the traveller, benighted,
Finds his weary feet refuse,

Let my battered earthen lamplet
Him once more with Hope infuse.
My Muezzin be the cuckoo,
when the night's last watch is gone
She will call and I shall answer
Chanting thus in antiphon.
Space my ears, the temple's jangling
And the mosque's loud morning cry,
Let my howl's chink and crevice
Softly tell when dawn is night
For the flowers when dew drops, gathering
Shall the morning bath prepare,
Let my tears be my ablution,
My Iament, my morning prayer.
Let my cry of Iamentation
In the stillness up ward smell,
Till the stars mistake its ringing.
For their Carvan's own bell.
Let the hearts that now are heavy
Learn from my tears how to weep,
that per chance some heed less sleepers
May be wakened from their sleep.(9)

ان نظموں کے تراجم سے راس مسعود کی علمی قابلیت اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے اور انھوں نے غنائی آہنگ اور صوتی تاثر کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ایک زبان کے فن پارے کی مکمل عکاسی دوسری زبان میں ایک مشکل امر ہے لیکن راس مسعود کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے "ایک آرزو" کی دلبستگی اور آزردگی کو ترجمے میں برقرار رکھا ہے۔

"تلمیحات و اشاراتِ اقبال" کے فاضل مصنف جناب ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے صفحات ۵۱۶ تا ۵۱۹ میں اقبال کی اس نظم کو انگریزی کے نسبتاً غیر معروف شاعر سموئیل راجرس (Samuel Rogers) کی ایک نظم "A Wish" کے مماثل قرار دیا ہے لیکن اقبال کی نظم راجرس کی نظم سے ماخوذ نہیں۔ ہوسکتا ہے راجرس کی نظم سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ نظم لکھی ہو۔ اقبال کی نظم کا آہنگ پس منظر اور طرزِ ادا منفرد ہے۔ اقبال کی یہ نظم منظر نگاری اور محاکاتی شاعری کی دلاویز مثال ہے۔ راس مسعود کا ترجمہ بھی انگریزی ادب کا پرکشش اور نادر فن پارہ ہے۔

راس مسعود ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو مختصر سے علالت کے بعد انتقال کر گئے اپنے جگری دوست اور سچے غمگسار کی اچانک اور المناک وفات پر اقبال بڑے مضطرب اور دل گرفتہ تھے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو ایک مرثیے کی صورت میں یوں پیش کیا ہے۔(۱۰)

رہی نہ آہ! زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است"

(سعدی)

اقبال کا یہ مرثیہ راس مسعود سے ان کی قلبی دوستی کا مظہر ہے اور جب تک شعر و ادب کی تاثیر باقی ہے۔ یہ مرثیہ ان کے انمٹ تعلق اور لازوال محبت کی یاد دلاتا رہے گا۔

راس مسعود کے انتقال کی خبر ۳۱/جولائی ۱۹۳۷ء کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ"، میں دیکھی تو انھوں نے فوراً والدہ مسعود کے نام تار دیا کیونکہ ان کی میت بذریعہ ریل بھوپال سے علی گڑھ لائی گئی تھی اور والدہ مسعود علی گڑھ میں مقیم تھیں تار کے الفاظ ان کی دلی کیفیات کے آئینہ دار ہیں اور ان سے اقبال کے رنج و الم اور دلی کرب کا اظہار ہوتا ہے:

"Irrepairable loss to islam and India. we all share you unbearable grief."(11)

راس مسعود کے کتبۂ مزار کے لیے اقبال نے درجِ ذیل رباعی ممنون حسن خان کے نام ارسال کی تھی۔

ز پیوستم در ایں بستاں سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چُو بادِ صبح گر دیدم دمِ چند
گلاں را آب و رنگی دادہ رفتم(۱۲)

بیگم مسعود کے نام اپنے خط میں تعزیت کا اظہار یوں کیا:

"مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا اور جب تک جیا، اس دل و دماغ سے ملک و ملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریقِ رحمت کرے۔"(۱۳)

علامہ اقبال نے راس مسعود کے پرائیوٹ سیکرٹری اور دوست کے نام مسعود کے غم کا ذکر یوں کیا ہے جو اقبال نامہ حصہ اول کے صفحہ ۳۳۰ پر مندرج ہے:

"مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں"

اقبال اور راس مسعود دونوں مجلسی زندگی کے رسیا تھے۔ دونوں نے ولایت سے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وکالت کا آغاز کیا۔ ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ نظامِ تعلیم سے وابستہ رہے۔ دونوں اُمتِ مسلمہ کے سچے غمگسار تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑھتے تھے۔ دونوں خدا ترس اور غریب پرور تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی دونوں کے لیے ذریعۂ راحت تھی۔ دونوں کے تعلقات برِصغیر کے عمائدینِ ملت سے استوار تھے۔ دونوں اردو زبان کے سچے عاشق تھے۔

دونوں حاجت مندوں اور ناداروں کی اعانت فرماتے۔

برِصغیر کے ان دونوں نابغوں کی زندگیوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طنیت را

حواشی:

(۱) "یادِ ایام": محمد عبدالرزاق کانپوری، ص۲۳۶، آتش فشاں، پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۳ء۔

(۲) سہ ماہی "فکر و نظر"، علی گڑھ: نامورانِ علی گڑھ نمبر، ص۱۵۱، پہلا کارواں۔

(۳) "یادِ ایام": محمد عبدالرزاق کانپوری، ص۲۴۵

(۴) "مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ": پروفیسر محمد سلیم، ص۱۱۷، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور ۱۹۸۵ء۔

(۵) "دیباچہ انتخابِ زریں": مرتبہ راس مسعود، ص۳، نظامی پریس بدایوں، بار اوّل، ۱۹۲۱ء۔

(۶) "بانگ درا": علامہ اقبال، ص۸۷ پر "آتا ہے" کا اندراج ہے۔

(۷) "شعلہ مستعجل" مرتبہ جلیل قدوائی مرحوم، ص۶۷تا۶۸، راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی، کراچی ۱۹۸۲ء۔

(۸) "بانگِ درا" میں اس کی موجودہ صورت یوں ہے: "شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا"۔

(۹) "Realms of gold": Jalil Ahmed Qidwai, page.35-40 Ross Masood Education of culture Society, Karachi. 1986.

(۱۰) "کلیاتِ اقبال اردو": علامہ اقبال، ص۲۳۷، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۴ء۔

(۱۱) ڈاکٹر رحیم بخش شاہین: "اقبال و مسعود" (مقالہ) سہ ماہی "اقبالیات"، اقبال اکادمی، لاہور اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء، ص۱۶۵۔

(۱۲) "پیامِ مشرق": علامہ اقبال، ص۳۹، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۱ء۔

(۱۳) "اقبالنامہ" حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطاءاللہ، ص۳۹۱تا۳۹۲، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۴۵ء۔

اقبال غزل خواں ہو

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

پھر فصل بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو

اقبال نے اردو غزل کی کائنات بدل دی اور اپنی اردو غزل کو انھوں نے خود ایک کائنات کا درجہ دے دیا۔ اقبال کا فنی کمال نظم و رباعی میں پایا جاتا ہے تاہم ان کی غزل میں بھی ان کی فکر و فن کی تمام خوبیاں جلوہ گر ہو گئی ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی فرد صرف غزل کے پیشِ نظر اقبال کے محاسن تک پہنچنا چاہے تو اقبال نے یہ آسانی بھی پیدا کر دی ہے:

اقبال کی آواز دنیائے تغزل میں پہلے پہل اجنبی بھی تھی اور منفرد بھی لیکن بعد کو یہی آواز ملتِ اسلامیہ کی دل کی آواز بن کر اُبھری۔ خواص کی شاعری عوام کے لبوں پر کیوں کر جاری ہوئی؟ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ اقبال کا اردو لہجہ حضور قلب کی زبان کا پروردہ ہے:

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

ہم نے ہمیشہ سنا کہ شعرا تلامیذ الرحمان ہیں لیکن اسے اعتبار ملا اقبال کے کلام سے۔ اقبال سے پہلے ہمیں یہ خیال نہ آیا کہ غزل عربی قصیدہ کی تشبیب کو کہتے ہیں۔ اقبال نے جو اس شعر میں اپنے سازِ سخن کو عجم سے ہلکی سی نسبت دی ہے وہ بھی اس لیے کہ مسلمانوں کا لسانی رویہ ماورائی رہا ہے اور جنوبی ایشیا کے شعرا نے اسی ماورائی رویہ کے سبب فارسی کو اپنایا تھا۔ مسلمان فاتحین ترک تھے یا افغان، خود بابر کی مادری زبان ترکی تھی لیکن بابر نے شعری اظہار کے لیے فارسی کو اپنایا جو وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا دونوں کی تہذیبی زبان تھی۔ اقبال کے فارسی کلام میں عجمی بانکپن ضرور ہے لیکن ان کی اردو شاعری میں سکوت شام حجاز کی تمام تر بلاغت سرایت کر گئی ہے:

تہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی
ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دل ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا وہی آہ نیم شبی رہی

بے شک نہ تو یہ اقبال کا پیغام ہے اور نہ اقبال کی منزل۔ یہ ایک گزرگاہ ہے مگر ایسی گزرگاہ جس سے اقبال کے تجربات کی صداقت عیاں ہوتی ہے:

اس کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

غور کیجیے کہ اس زندۂ جاوید شعر کی موجودگی میں اقبال پر جوش جیسے ناقدین کی طرف سے یہ اعتراض آیا کہ اقبال نے عشق کو عقل پر مقدم کر دیا۔ اولاً یہ شعر بتا رہا ہے کہ یہ کوئی سیدھا سادہ عمل نہ تھا دوئم وہ اقبال کی تعریف کو نظر انداز کر دیتے ہیں:

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بےچارہ نہ زاہد ہے نہ ملا نہ حکیم

یہاں تک کہ اقبال وہب و وجدان کی بھی غیر مشروط پیروی نہیں کرتے:

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

دیگر یہ بات ایک مبتدی پر بھی عیاں ہے کہ اقبال کے یہاں عشق عقل کی ضد سے زیادہ عقل کی عملی جہت کا نام ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال کا موقف بس اس قدر ہے کہ عقل انسانی کی رسائی محدود ہے عشق کی لامحدود۔ عقل کا تعلق اسباب سے ہے، عشق کا تعلق اثرات سے، اسی لیے اقبال عشق کی بے کرانی کے قائل ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور یہیں سے ہم اقبال کے دوسرے مدار تغزل میں داخل ہوتے ہیں۔ اقبال کے یہاں کائنات سے اتصال اسی ستاروں سے آگے والے جہاں میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ عشق نہ غم جاناں ہے نہ غم دوراں یہ کچھ اور ہی ہے:

رُلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

یوں اختر شماری کون سی جدت ہے لیکن آسمان سے ہم آہنگی کا احساس ایک بالکل نئی جہت ہے جس کی ندرت محتاج بیان نہیں:

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں سو گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

اسی سے زیادہ وضاحت اس شعر میں ہے:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اب اقبال کا ایک مطلع دیکھیں یہ روایتی غزل سے کتنا آگے ہے اس کا اندازہ غالب کے اس مطلع سے کیجیے جس کے لیے غالب کو روایتی غزل ہی نہیں روایتی قصیدہ کے حدود ناکافی معلوم ہوئے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

مطلع یہ ہے:

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی

اور جب روایتی تغزل کا ذکر آ ہی گیا ہے تو ایک نظر اقبال کے ابتدائے دور شاعری پر بھی۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنے استاد داغ کی جانب بڑھے تو اس قدر:

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

دوسرا ہی مصرعہ دوسری ہی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ اقبال کے تغزل کی اگلی منزل ملاحظہ ہو جو گرچہ روایت کے دائرے سے باہر نہیں مگر اپنے گمبھیر لہجے کی وجہ سے منفرد ہے:

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

اگر صحیح معنوں میں کوئی روایتی مضمون اقبال کی غزلوں میں پایا جاتا ہے تو وہ واعظ پر طعن کا مضمون ہے:

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا کہ جو بندوں سے احتراز کرے

غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگان خدا پر زباں دراز کرے

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبا بھی چھوڑ دے

مگر اس مضمون کی تکرار اس وجہ سے ہے کہ اسی سے اقبال کا پیامی مزاج معین ہوا ہے۔ اب تیسرے مرحلے میں اقبال کا وہ محتشم و منفرد رنگ تغزل جو جدید اردو شاعری کی ایک مضبوط بنیاد بن گیا:

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

سپاس شرط ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

یہ پیمائشی ادراک سے آہنگ شعر وضوع کرنے کا پہلا تجربہ تھا اور اسی کے ذریعہ اقبال نے فکری فقرہ سازی کے کئی در وا کیے۔ اس داخلی ترکیب کے ساتھ ایک دوسری بحر اور ایک دوسری فضا:

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

اس گلستاں کے حوالے سے اقبال کے چمن نظم تک آئیے۔ نظیر صدیقی نے اقبال و فیض دونوں کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ان کی نظموں میں غزلیت بھی ہے۔ اگر تغزل غنائیت مطلق کے معنوں میں آیا ہے تو فیض کی نظمیں اس تعریف میں آتی ہیں مگر اقبال کی نظمیں اس تعریف میں نہیں آتیں۔ اس کی بہت سامنے کی مثال اقبال کی غزل کے یہ شعر ہیں:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے ہم نے پائے ہیں

شگفتگی کے باوجود یہ غزل میں نظمیت کی مثال ہیں۔ ہاں اگر تغزل اظہار کے تخلیقی رچاؤ کے معنی میں آیا ہے تو بے شک یہ اردو کو اقبال کی خاص دین ہے۔ ایک چھوٹی بحر کی مختصر غزل ملاحظہ ہو۔ اس میں اقبال کے سارے فکری ابعاد سمٹ آئے ہیں ان کا پیغام اور اس کی روح ان اشعار میں جلوہ گر ہیں:

فطرت کو خرد کے رو بہ رو کر
تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا سے بیکرانہ
تو بھی یہ مقام آرزو کر
بے ذوق نہیں ہے گرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

تقدیر آدم کو اتنے سادہ الفاظ میں اتنی رفعت کے ساتھ بیان کرنا سخن کا معجزہ ہے۔ بحر سے مثنوی کا تاثر دے کر رزمیہ آہنگ کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اتنے وسیع معنی کو اتنی مختصر غزل میں سمو کر ہی اقبال نے غزل کی کائنات بدلی ہے۔ اس سے قدرے زیادہ

دل نشیں لہجہ اقبال کی سب سے اعلیٰ اور سب سے معروف غزل میں ملاحظہ ہو:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبیں نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

یہ لطافت اقبال کی جانب سے قدیم مذاق سخن کے لیے ایک رعایت ہے تاہم اسی نے ان کی غزل کو دلبری عطا کی۔ اس کے ساتھ وہ شعر بھی سنتے جائیے جو "بانگِ درا" میں تو نہیں مگر فروری ۱۹۱۱ء کے "مخزن" میں ہے:

کوئی آج مسلم خستہ جاں کو یہ جا کے میرا پیام دے
جو وطن ہے دشمن آبرو تو اماں ہے ملک حجاز میں

مری خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ
غریب و سادہ رنگیں ہے داستاں حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

اس لہجہ کی تجلی اور اس کی للکار پہ غور کیجیے۔ اس نے رزمیہ آہنگ کو غزل میں اس طرح سمویا کہ کلاسیکی مرثیہ جدید انقلابی مرثیہ کی راہ پر آ گیا۔ یہ یاد رہے کہ اس لہجے کی ابتدا داغ کے تلمذ سے ہوئی تھی:

فضا میں ایک تموج سا زمیں سے آسماں تک ہے
کہاں چھیڑا ہے اس نے ساز بیداری کہاں تک ہے

غالب تک اردو کی فکری شاعری مزاجاً گمان کی شاعری تھی۔ اقبال کی فکری شاعری یقین کی شاعری بن کر ظاہر ہوئی۔ گمان کی سطحیں کئی ہیں اس لیے گمان شعری مزاج کی خاصیت تھی۔ یقین ابدی ہے اس لیے یقین شعر کی ماہیت ہے اور اس یقین نے اقبال کے لہجے کو برق آسا کیا:

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

******

علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات

پروفیسر انجم بانو کاظمی

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ایک طرف تو مغرب کی استعماری اور استحصالی قوتوں کی بالادستی کی انتہا ہے دوسری طرف مشرقی عوام کی بیداری کی ابتدا۔ عالم انسانیت کے ان محسنوں میں جنھوں نے مردہ قوموں کے لیے صور پھونکا اقبال کا نام بھی شامل ہے۔

اقبال نے جس طرح اپنی اردو فارسی شاعری سے مسلمان قوم میں بیداری کا شعور پیدا کیا۔ جس طرح ان میں احساسِ زیاں پیدا کیا آج اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان قوم رفتہ رفتہ اس منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے جس کا راستہ اس راہ نما نے دکھایا تھا۔ اور اس راستے پر چلنے کے لیے جس ذریعے کی نشاندہی کی وہ تعلیم ہے۔

اگرچہ اقبال فلسفہ کے پروفیسر تھے ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا براہِ راست تعلیم کے شعبے سے تعلق نہیں تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ اقبال کے کلام میں تعلیم کے ہر شعبے سے متعلق بلند اور واضح خیالات ملتے ہیں ایک ایسا مفکر جس کی نظر زندگی کو اور اس کے نشیب و فراز کو پرکھ رہی ہو کیونکر اس عمل کو نظرانداز کر سکتا تھا کہ جو مکمل زندگی کا عمل ہے۔ ہر فرد کی مکمل زندگی کو محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا کلام پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تعلیم کا کوئی شعبہ اقبال کے افکار کی زد سے دور نہیں۔ اقبال تعلیم کے متعلق کیا تصورات و نظریات رکھتے تھے۔ ان کا تعلیم کا فلسفہ کیا تھا یہ ہم ان کے کلام کی روشنی میں با آسانی جان سکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ ایک جسم کی مانند ہے اور تعلیم اس معاشرے کی روح بقول غلام السیدین انسان کی پرورش کرنا اس کی تربیت کرنا ہی دراصل تعلیم ہے اور اقبال کا مکمل کلام انسان اور انسانیت، روح اور روحانیت، فرد اور معاشرہ، غرض مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے وہ انسان کو اس کی معراج پر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے جس ذریعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ تعلیم ہے۔

اقبال نے یورپ کی اعلیٰ درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عرصہ تک عربی کے پروفیسر رہے۔

اقبال کے نزدیک مقصد تعلیم:

کوئی بھی عمل اس وقت تک صحیح راہوں کو اختیار نہیں کر سکتا جب تک صحیح طور پر منزل کا تعین نہ کر لیا جائے۔ منزل کا تعین راہ کی دشواریوں کو آسان بناتا ہے۔ سوچ کی تعمیر کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ اسی طرح مقصد تعلیم کی سطح کے بغیر منزل کی تلاش ایک سعی لاحاصل ہے۔ بے مقصد تعلیم ایک ایسی جدوجہد ہے جو اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے کی مانند ہے۔ اقبال بھی عمل کے لیے

مقصد کے تعین پر زور دیتے ہیں وہ اس تعلیم کا پرچار کرتے ہیں جو انسان کو صرف عقل کا غلام نہ بنا دے صرف مادیت پرستی میں نہ الجھا دے بلکہ انسان کے دل کی دنیا میں اجالا کر دے اس کے دل کو روحانی و وجدانی سرور عطا کرے۔ اس کے ذہن کو جِلا بخش دے:

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز تعلیم النفس و آفاق نیست

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

سیدِ کل صاحب اُم الکتاب
پر دگیہا بر ضمیرش بے حجاب

گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
رب زدنی از زبان او چکید

اقبال کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور پر اس زمانے کے نظام تعلیم میں انقلاب و حرکت لانا چاہتے تھے۔

اقبال کے فلسفہ تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ وہ انسان کی صلاحیتوں، رجحانات، طاقتوں اور جبلتوں کی بچپن سے پرداخت چاہتے ہیں تاکہ ابتدائی عمر ہی سے بچے کے دل و دماغ کی ایسی نشوونما ہو کہ وہ نہ صرف ذہانت و لیاقت حاصل کریں بلکہ فوجی اور ملکی وقار کے تحفظ اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کر سکیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پورے نظام کی بنیاد اسلامی نظریۂ حیات و کائنات پر رکھی جائے اس لیے کہ یہ وہ بنیاد ہے وہ مرکز ہے جس کے گرد حیات انسانی مختلف موارض سے گزر رہی ہے۔ اسی لیے اقبال تعلیم کو صرف جسمانی ہی نہیں روحانی بلندی کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ غلام السیدین صاحب نے ایک خط میں اقبال سے سوال کیا کہ وہ علم جو صرف ذہن کی مدد سے حاصل کیا جائے اور وہ علم جو وجدان کے ذریعہ سیکھا جائے دونوں میں کیا فرق ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم حق کی ابتدا ہے۔"

اقبال کے نزدیک علم ایک یقینی شرطِ حیات ہے وہ کہتے ہیں:

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

گویا اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو دینی و روحانی اقدار اور نظریاتی نصب العین کے رنگ میں رنگ دے۔ وہ حواس، تجربات، مشاہدات اور منطق سے حاصل شدہ حکمیاتی، طبیعاتی علوم کو دین سے علاحدہ کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں دین، سائنس اور حکمت ایک ہی مضمون کے مختلف حصے ہیں ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔

غرض یہ کہ اقبال نے اپنے نظامِ تعلیم کی غرض زندگی میں تب و تاب پیدا کرنا قرار دیا ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب قوم کے نونہال طالب علم بلند مقاصدِ حیات کو پیشِ نظر رکھیں۔ وہ خود میں ان صفات کو پیدا کریں جن کو اقبال شرطِ حیات قرار دیتا ہے۔ جیسے خودی، عشق، عقل، خضر، عمل، جستجو، نمود، تسخیر و تصرف:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

اقبال کہتے ہیں:

"وہی طریقہ تعلیم کامل ہو گا جو نفس ناطقہ کے تمام قویٰ کے لیے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے اور ایک تخیل، تاثر غرضیکہ نفس ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیے۔ کیونکہ کامل طریق تعلیم کا منشا یہی ہے کہ نفس ناطقہ کی پوری قوتیں کامل پذیر ہوں نہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔"

یہ کائنات پروردگار کے نظام قدرت کا ایک نمونہ ہے کہ جس کی ہر شئے جس میں ہونے والا ہر عمل ایک خاص نظام و ترتیب کے تحت ہے۔ اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں نظام تعلیم ایسا قرار پاتا ہے جو طالب علم میں اخلاقی اوصاف کو اس طرح نمایاں کرے کہ وہ حضرت حسینؓ کی طرح سچائی اور انسانیت کی خدمت کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرے بلکہ اقبال کے نزدیک یہی کمالِ انسانیت ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ بچے کو پڑھانے کی ضرورت نہ پیش آئے بلکہ اس کے سامنے عمل کے وہ نمونے ہوں جو اس میں تعلیم کی روح اس طرح سمو دیں کہ وہ اس کی فطرت بن جائے اسے اسلام کی تعلیمات رٹانے کو ضرورت نہ ہو اسلام اس کی فطرت بن جائے تاکہ اس کے کردار میں جسارت اور فقرو تحمل پیدا ہو۔ اقبال ایک ایسے نظامِ تعلیم کے خواہاں نظر آتے ہیں جس کی بنیاد طالب علم ہے جس کی جبلی ذہنی، وروحانی طاقتوں کو تعلیم کے ذریعہ سنوارا جائے گا۔ بقول مولانا رومی:

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اس دور کے نظام تعلیم پر اقبال کو سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ یہ نظام فرد کو محض معاش کا بندہ بناتا ہے اور طالب علم کو افکار کی دولت سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کی جسمانی ضروریات کی تشفی کر دیتا ہے۔ لیکن روحانی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ ایسی تشنگی جو روح کو سیراب کر دے اور اسے اس مقام تک پہنچا دے جو مقصد تخلیق انسان ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نظر سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

اقبال چاہتے تھے کہ نظامِ تعلیم ایسا ہو جو فرد میں اپنے مقام کی اہمیت اور مقصدِ زندگی کو واضح کر دے تاکہ اس میں احساسِ ذمے داری و خود اعتمادی پیدا ہو۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ وہ خود اپنے طور پر سوچے اور عمل کرنے کے قابل ہو سکے۔ اسے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی حاصل ہو محمد احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"ہر نظامِ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ واضح طور پر بتائے کہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا اس کا نصب العین ہے کیونکہ ہر نظریۂ تعلیم کی اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار اس قسم کے کردار پر بھی ہوگا جس کو اس نے اپنے سایۂ عاطفت میں تخلیق کیا ہے۔"

اقبال چاہتے تھے کہ نظامِ تعلیم ایسا ہو جو فرد کو خود اس کی حقیقت سے آشنا کر دے۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبال کے نزدیک طریقۂ تدریس:

اقبال کے نزدیک حصولِ علم کا بہترین ذریعہ تجربات ہیں۔ تجربات فرد کو سوچ و فکر اور نئے طریقوں سے روشناس کرواتے ہیں اور ان کی بنیاد پر نئی ایجادات ہوتی ہیں اور فرد و معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ یہ کائنات پروردگار نے انسان کے لیے مسخر کر دی ہے اس کے مادی وجود کو تسلیم کرنا اور قدرت کے عطا کردہ خزانوں کی تلاش کرنا طالب علم کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی بغیر عمل ممکن نہیں۔

انسان مرکزِ تخلیق ہے اس کی فطرت میں تجسس و انقلاب پسندی ہے۔ خدا نے اسے عمل کی قوت بخشی ہے۔ اسے فکر و فہم کی نعمتوں سے نوازا ہے اس کے خمیر میں عشق و محبت ہے اس نے اہمیت و اسرار دنیا و کائنات کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب طالب علم میں علم کے حصول کی سچی لگن جگا دی جائے۔ علم کا شوق ابھارا جائے۔ اس پر تعلیم کو ٹھونسا نہ جائے اسے تعلیم کی طرف مائل کیا جائے۔ اور علم بذریعہ عمل اس کی بہترین شکل ہے کہ اسلام نے ہمیں رسول ﷺ کی ذات میں مکمل نمونہ دیا۔ اقبال کے نزدیک عمل ایک یقینی شرطِ حیات ہے:

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سیدین صاحب نے علم کے ارتقا کے دو عناصر تلاش کیے ہیں۔ ایک آزادیِ خیال دوسرا آزادیِ عمل۔ اقبال طالب علم میں ان ہی دونوں باتوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ طالب علم میں تنقیدی سوچ و فکر اور تحقیقی نظر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

جہدِ مسلسل:

اقبال کا فلسفۂ تعلیم ایک ایسے انسان کی تصویر پیش کرتا ہے کہ جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں، انفرادی و اجتماعی کردار میں بلندی کا حامل اور اسلامی روایات کا نمونہ ہو جس کی فطرت میں تجسس ہو جو جہدِ مسلسل پر یقین رکھتا ہو کہ یہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ تھک کر بیٹھ جانا خلافِ فطرت مومن ہے۔ اقبال کا مردِ مومن خود اپنے لیے نئے راستوں کی تلاش کرتا ہے کہ نئی راہوں کی تخلیق کامیابی کی بنیاد ہے۔

اقبال کا مردِ مومن کسی ایک مقام پر رک جانے والا نہیں وہ چاہتے ہیں کہ نظامِ تعلیم ایسا ہو جو ایسے افراد پیدا کرے جن میں مسلسل آگے بڑھنے کی لگن ہو۔ جو ہمیشہ ہارنا نہ جانتے ہوں:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

اور حقیقتاً تعلیم وہی ہے جو فرد میں شوق کو اجاگر کر دے اس میں تجسس پیدا کرے اسے تلاش کی ہمت عطا کر دے۔ بصیرت دے تاکہ وہ قرآن کے فرمان کے مطابق اس کائنات کے اسرار و رموز کو منکشف کرتا چلا جائے۔ کائنات کو مسخر کرتا جائے نئی نئی ایجادات کر کے خود اپنی ذات کے لیے اور پورے انسانی معاشرہ کے لیے ترقی کے راستے کھول دے۔

تعلیم فرد اور معاشرے کی درمیانی کڑی:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تعلیم کے نظریات میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلیاں آتی رہیں کسی نے تعلیم میں معاشرے کو اہمیت دی کسی نے فرد کو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں تعلیم کا مقصد ایک رہا کہ ہر نسل نے یہ خواہش کی کہ جن مشکلات سے وہ گزر چکی ہے ان کے بعد آنے والی نسلیں اُن سے نہ گزریں اور یہی ترقی کی بنیاد ہے۔ اور اسی لیے تعلیم کا ایک مقصد معاشرتی ترقی قرار دیا گیا جو فرد کو اس طور پر تیار کرتی ہے کہ وہ معاشرے کا ایک فعال پرزہ ثابت ہو اس لیے کہ فرد کے دم سے معاشرہ ہے اور معاشرے کے دم سے فرد کی زندگی اور بقا۔

اقبالؒ کا تعلیمی نظریہ فلسفۂ خودی کی روشنی میں:

اقبال کی شاعری میں فلسفۂ خودی کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ ان کا مقصدِ حیات ہی خودی کے اسلامی تعمیری اور عرفانی حقائق کی تبلیغ تھا۔ خودی کا یہ سرمدی پیغام جو تعلیماتِ اقبال کا سنگِ بنیاد ہے ایک ایسے نظامِ تعلیم کو معرضِ وجود میں لانے کا متقاضی ہے جس میں خودی کا عمل جاری و ساری ہے۔ گویا اقبال کے لیے خودی تعلیم کا ایسا جذبہ ہے جو اسے مقصد تخلیق سے روشناس کر

دے جو اس میں احساسِ خودی پیدا کردے وہی تعلیم اصلی تعلیم ہے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"اقبال کا عقیدہ ہے کہ شخصیت اپنے ذوقِ یقین کے ذریعے سے اپنی تقدیر خود بنا سکتی ہے۔ وہ خود تقدیر الٰہی ہے، خودی کی بلندی کے بعد خدا کو بھی بندے کی رضا درکار ہوتی ہے۔ سچائی نیکی اور حُسن جب شخصیت میں جمع ہوجائیں تو زمان و مکان پر اپنا نقش ثابت کر سکتی ہیں۔"

اور اقبال ایسی ہی تعلیم کے حامی ہیں جو اسے سچائی، حسن اور نیکی کے احساس سے بھرپور کردے جو اسے حقیقی زندگی کی پہچان بنادے کہ جب حقیقت کی تلاش ہوگی تو مجاز خود بخود راستہ دیتا چلا جائے گا یوں افلاطون کا فلسفی بادشاہ اقبال کے مردِ مومن سے بہت پیچھے نظر آتا ہے کہ اقبال کے سامنے عملی شکل میں سب کچھ موجود ہے جو اسلام نے پیش کیا۔

تعلیم آزادی ضمیر کی محرک:

اقبال کے نزدیک تعلیم وہ عمل ہے جو انسان میں آزادیِ ضمیر کی قوت پیدا کرے جو اسے سچائی پر لبیک کہنے کی جرأت عطا کرے، اس میں باطل کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے کا جذبہ پیدا کرے اقبال کے نزدیک ایسی تعلیم جو ضمیر کی آواز کو دبادے تعلیم نہیں۔ اقبال کا مردِ مومن نعرۂ مستانہ لگاتا ہے:

فقر عریاں گرمیِ بدر و حنین
فقر عریاں بانگ تکبیر حسین

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خونِ او چمن آباد کرد

انفرادیت کا ارتقا:

مکیڈونل کا نظریہ انسان جبلتوں رجحانات اور مختلف احساسات و جذبات کا مجموعہ ہے لیکن اصل شے اس کی ذاتی صلاحیتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے تعلیم کی غرض و غایت در حقیقت انھیں جبلتوں کی ترتیب ہے تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ فرد میں موجود صلاحیتوں کا پتہ چلائے ان کو نمو کرے ان کو سنوارے تاکہ ان صلاحیتوں کو معاشرہ کی بہتری اور خوشحالی کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ اس طرح فرد کی اپنی زندگی اور معاشرہ دونوں ترقی کر سکیں گے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"اقبال انسانیت کے پرستار ہیں وہ انسان کو فطرت کا شاہکار سمجھتے ہیں زندگی کا مقصد ان کے نزدیک انسانیت کی تکمیل کرنا اور فطرت کا اس تکمیل کے لیے مناسب منزلیں پیدا کرنا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا مقصد خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنا ہے خدا خود ایسے انسان کی تلاش میں ہے۔"

بعد خدا اقبال کا عقیدہ ہے کہ شخصیت اپنے ذوقِ یقین کے ذریعے سے اپنی تصاویر آپ بنا سکتی ہے۔ وہ خود تقدیر الٰہی ہے، خودی کی بلندی، کہ اللہ کو بندے کی رضا درکار ہوتی ہے۔ سچائی نیکی اور حسن جس شخصیت میں جمع ہو جائیں تو زمان و مکان پر اپنا نقش ثبت کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انفرادیت کی نشوونما کرے، خود کو بے حقیقت نہ بنائے۔ اپنی قدر و قیمت خود پہچانے۔ یہ تعلیم کا ہی کام ہے کہ ایک طرف انفرادیت کو سنوارتی ہے اور دوسری جانب ماحول کو درست کرتی ہے۔ ان دونوں کے اشتراک اور تعاون کا نتیجہ معاشرہ کی بہتری اور خوشحالی ہے:

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے اور نہ سیہ کار رہے

تعلیم اور محنت کی عظمت:

اقبال کے نزدیک تعلیم کی ایک اہم ذمے داری، کام اور محنت کی عظمت کا احساس پیدا کرنا ہے۔ کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے رسول ﷺ نے خود اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر عملی نمونہ پیش کر دیا۔ اور تاکید کی کہ مزدور کی اجرت پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔ اقبال کی نظم زندگی، مزدور سب اس بات کے شاہد ہیں کہ اقبال کے نزدیک کام کی عظمت کیا تھی اور اگر غور کیا جائے تو یہ احساس یہ خیال یہ جرات پیدا کرنا صرف تعلیم کی بدولت ممکن ہے لیکن تعلیم ایسی ہو جو صرف جسمانی نہ ہو بلکہ روحانی بھی ہو:

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اقبال تعلیم کے ذریعے فرد میں ایک ایسی تبدیلی دیکھنا چاہتے ہیں جو اس کو اس کے حقیقی مقام تک پہنچا دے جو اسے خلیفۃ المسلمین کے منصب کے مطابق بنا دے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی لکھتے ہیں:

"ارسطو کہتا ہے کہ انسان کے لیے اپنی منزل تک رسائی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اسے عمر جاوداں حاصل ہو جائے لیکن حکیم مشرق اس رائے سے متفق نہیں وہ کہتے ہیں کہ ارسطو انسانی قوتوں کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا بے شک انسان کی منزل کہکشاں سے آگے ہے لیکن یہ اپنی بے پناہ طاقتوں کے بل پر ہر منزل کو سر کر سکتا ہے۔"

فضا تیری مہ و پروین سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ فرد احساسِ ذات کے ساتھ ساتھ احساسِ ملت بھی رکھے جو کام کرے اس کے ذہن میں یہ واضح ہو کہ اس کا ہر انفرادی فعل اجتماعی طور پر معاشرے پر اثرانداز ہو گا اس لیے اقبال کے کلام میں جگہ جگہ دستورِ ملت پایا جاتا ہے وہ دینی تعلیم کے حامی ہیں جو مسلمانوں کو ان کے کھوئے وقار اور مقام کو واپس دلانے میں معاون ہوں ان میں یک جہتی اور تعاون پیدا کرے تاریخ سے ان کا رابطہ مضبوط کرے اس لیے بقول ڈاکٹر یوسف حسین:

"جس طرح ایک فرد احساسِ ذات ارادہ اور حافظہ کے ذریعے سے اپنی ذات کی گہرائیوں کی تہ تک پہنچتا ہے اُسی طرح قومیں اور جماعتیں اپنی تاریخ کے ذریعے سے اپنی اجتماعی خودی کو مستحکم کرتی ہیں۔ تاریخ کی بدولت ماضی و حال کا تعلق استوار ہوتا ہے اور قوم کا وجود تجربہ کی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔"

اسی لیے اقبال کہتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اور اقبال کے نزدیک مدرسہ کی تعمیر کا مقصد یہی ہے کہ وہ بچوں میں نہ صرف احساسِ ذات بلکہ احساسِ ملک و ملت پیدا کرے۔ انھیں ایک قوم ایک جذبے میں باندھ دے اور اس مقصد کے حصول میں سب سے اہم ذمے داری اقبال معلّم کو سونپتا ہے اقبال نے اپنے فکر و فلسفہ میں معلّم کو مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ وہ کل ذمے داری پوری قوم کی معلم کے سپرد کرتے ہیں۔ کیونکہ بقول امام غزالی:

"معلّم اور شاگرد کا رشتہ ستون اور اس کے سایہ کی مانند ہے اگر ستون میں خم ہو تو ممکن نہیں کہ اس کا سایہ سیدھا ہو۔"

اسی لیے اقبال فرماتے ہیں:

"معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلّم کی کارگزاری ہے۔ معلموں ہی سے علم کا سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں تمدنی اور سیاسی برتری مخفی ہے۔ جس سے قومیں معراجِ جمال تک پہنچ سکتی ہیں۔"

اقبال اور نصابِ تعلیم:

نصابِ تعلیم وہ لائحہ عمل ہے جس پر چل کر قومیں مقاصدِ تعلیم کے ذریعے مقاصدِ زندگی کا حصول کرتی ہیں۔ ہر ملک کا مقصد تعلیم اس کے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظامِ حیات کا مظہر ہوتا ہے۔ اور نصاب ہی کے ذریعے قومیں اپنے افکار اور ورثہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتی ہیں۔ جس دور میں اقبال نے آنکھ کھولی انگریزوں کے اقتدار کا دور تھا پورا نظامِ تعلیم انگریزوں کے مقاصد کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ اقبال جیسے حساس فرد کے لیے یہ احساس کہ مسلمان قوم وہ تعلیم حاصل کر رہی ہے جو اسے غلام تو بنا سکتی ہے آزاد ذہن فرد نہیں۔ اسی دور میں اقبال نے فلسفۂ خودی پیش کیا۔ قوم کو اپنی شاعری کے ذریعے آزادی کا شعور بخشا اسی لیے فرماتے ہیں:

"نصاب میں ایسے مضامین کا انتخاب ہونا چاہیے جن میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو۔ تاکہ طلبہ ان کے مطالعے کے بعد کشاکش حیات میں استقلال، خودداری اور اعتماد کے ساتھ حصہ لے سکیں۔"

اقبال کی نظر میں نصابِ تعلیم وہ ہے جو فرد کو حقیقی زندگی کے لیے تیار کرے اسے صحیح طور پر مردِ مومن بنائے کہ جو اسلام پر چلتے ہوئے اس کائنات میں وہ کچھ کرے کہ جس کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی۔

اقبال اور تعلیمِ نسواں:

اقبال عورتوں کی تعلیم کے حامی ہیں لیکن اس حد تک جس حد تک وہ خاتون خانہ رہے، شمع محفل نہ بن جائے۔ اقبال کے نزدیک عورت کی تعلیم کا مقصد اسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ ایک بہترین بیوی اور بہترین بہن ثابت ہو، اسے ایسی تعلیم دی جائے کہ اس کی آغوش میں پلنے والی نسل تعلیماتِ اسلام کا نمونہ ثابت ہوں اسی لیے اقبال خاتونِ جنت کی زندگی کو عورتوں کے لیے ایک نمونہ قرار دیتے ہیں۔

قرآن نے عورت کو ایک عظیم نعمت سے تعبیر کیا ہے جن کی محبت پیغمبرانہ شفقت کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی تربیت سے آئندہ نسلوں کی سیرت کی تعمیر کرتی ہے۔ اسی لیے اقبال عورتوں کی موجودہ تعلیم کی منافی کرتے ہیں جو اسے دین س بے گانہ بنا کر شمع خانہ کے بجائے شمع محفل بنا رہی ہے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

مجموعی طور پر اقبال کا تعلیمی فلسفہ اس مدار کے گرد گھومتا ہے کہ انسان مرکز کائنات ہے۔ قوت عمل رکھتا ہے قوت فیصلہ رکھتا ہے تو اس کا ہر عمل بہتر سے بہتر کی طرف ہونا چاہیے اور تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ ان راہوں پر آنے والی تمام دشواریوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہ طالب علم کو مسلسل جدوجہد اور عمل میں مصروف دیکھنا چاہتے ہیں ایسا عمل جو تعمیری ہو جو نہ صرف خود اس کی ذات کے لیے بلکہ ملک و ملت کی بھلائی کے لیے ہو۔ اقبال تعلیم کو مکمل عمل قرار دیتے ہیں:

نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"اقبال نے اپنی قوم کی بے عملی کے جو اسباب بتائے ہیں وہ بے عملی اور ناکامی میں ان کے یہاں عمل، روز مرہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے والی سرگرمی سے عبارت ہیں۔ ان کے نزدیک عمل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہر آنے والا دن ہر گزرے دن سے بہتر ہو:

اگر امروز تو تصویر دوس است
بخاک تو شرار زندگی نیست

اعتذار

قومی زبان اکتوبر ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۲۹ پر سہواً شاہد حمید کی جگہ یاسمین حمید رقم ہو گیا ہے، ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔ جناب شاہد حمید نے ٹالسٹائی کے عظیم و ضخیم ناول "وار اینڈ پیس" کا ترجمہ کر کے اردو ادب میں گراں بہا کام سرانجام دیا ہے۔

اطرافِ رشید احمد صدیقی

مصنف: اسلوب احمد انصاری

قیمت:- ۱۰۰/ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

سر سید احمد خاں

حالات و افکار

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیمت:- ۷۵/ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

اردو شعرا کے تذکرے

اور

تذکرہ نگاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قیمت:- ۲۵۰/ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

چین میں اسلامی خطی نسخوں کا سروے (۱)

تحریر : تنگ ھوی جو*
مترجم: ڈاکٹر محمد اقبال شاہد**

"چین میں اسلامی خطی نسخوں کا سروے" ڈاکٹر مظفر بختیار(۲) کی تالیف ان بنیادی تحقیقات میں سے ہے جو چین، ایران شناسی اور ہر دو ممالک کے عظیم ثقافتی ورثہ کے تعارف کے لیے انجام پائی ہیں۔

یہ سروے انگریزی زبان میں چار جلدی مجموعے "World Survay of Islamic Manuscripts" کے ایک حصے پر مشتمل ہے جو الفرقان اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن، لندن نے چھاپا ہے۔

استاد ارجمند ڈاکٹر سید جعفر شہیدی(۳)، ڈائرکٹر موسسہ لغت نامہ دھخدا، نے راقم کی تصحیح کردہ کتاب "فرہنگِ وفائی" کے مقدمے میں لکھا ہے:

> "ڈاکٹر مظفر بختیار کی تالیف "چین میں اسلامی خطی نسخوں کا سروے" کے انتشار سے اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کہ سرزمینِ چین، دنیا میں فارسی خطی نسخوں کی اہم اور قابل توجہ سرزمین ہے۔ چین میں متعدد فارسی متون اور خطی نسخوں کی موجودگی اپنی خاص اہمیت کے علاوہ کتاب شناسی اور ثقافتی و علمی میراث کے اعتبار سے قدیم ادوار سے زمانہ حال تک فارسی زبان کی وسیع قلمرو کی نشاندہی کرتی ہے۔"

میں نے "فرہنگ وفائی" (انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۷۴ش) اور نشریہ کتاب داری، دانشگاہ تہران (شمارہ ۲۱-۲۳) میں قدیم چین میں فارسی زبان کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کے بارے میں چینی و فارسی تاریخی اسناد و ماخذ نیز دوسرے خارجی حوالوں کے ساتھ بحث کی ہے۔

"فرہنگ وفائی" چین میں سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں تالیف ہوئی اور اس کے جدید ترین خطی نسخوں کی تاریخ جو کہ لائبریری نیوجیہ پیکنگ اور کتاب خانہ خاور شناسی (اورینٹل کالج لائبریری) پیکنگ یونیورسٹی میں موجود ہیں، بہ ترتیب ۱۸۵۰ اور ۱۸۷۹عیسوی تک پہنچتی ہے۔ یہ ایسی اہم سند ہے جو ثابت کرتی ہے کہ فارسی زبان گزشتہ صدی تک چین میں اعلیٰ سطح پر رائج رہی

---

*(Teng Huizhu) استاد شعبۂ فارسی، پیکنگ یونیورسٹی، چین۔
**استاد شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، پاکستان۔

ہے اور چینی فارسی دان طبقہ اس قسم کی لغت کی ضرورت محسوس کرتا تھا خود میں نے قدیمی لغت نامۂ چینی بہ فارسی (Hui hui guan yiyu) جو تقریباً ۱۶۸۶ الفاظ پر مشتمل ہے، کے متن کی تصحیح کا کام بھی حال ہی میں ختم کیا ہے اور چھپنے کے لیے تیار ہے۔

یہ موضوعات کی ترتیب کے لحاظ سے لغت نامہ ہے جس کی جمع آوری اور تالیف دورۂ یوانگ (۱۲۸۰-۱۳۶۸ عیسوی) کے اواخر اور دورۂ مینگ (۱۳۶۸-۱۶۴۴ عیسوی) کے اوائل میں ہوئی۔ اسی اثنا میں اسے خطی نسخے کی صورت کے علاوہ لکڑی کی چھپائی کی صورت میں جو قدیم چین کی اختراعات میں سے ہے، چھاپا گیا اور یہ امر قدیم چین میں فارسی زبان کی اہمیت کی دوسری سند ہے۔ کتاب کے مقدمے میں، میں نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ تاریخی اسناد و مدارک کے مطابق شاہراہِ ریشم کی حدود میں فارسی زبان بہ طور زبان رابطہ (Lingua Franca) اور بین الاقوامی زبان استعمال ہوتی تھی۔ اس بنا پر فارسی زبان کا تاریخی اثر و رسوخ اس بات کا متقاضی تھا کہ فارسی خطی نسخے جو پورے چین میں بکھرے پڑے ہیں علمی انداز میں متعارف کرائے جائیں۔

کتاب کے مولف ڈاکٹر مظفر بختیار، ایسے شائستہ چین شناسوں میں سے ہیں جن کے اس موضوع پر آثار و تحقیقات چینی اساتذہ اور دانش مندوں نیز معروف و برجستہ چین شناسوں کے نزدیک خاص اہمیت کے حامل ہیں اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں اسی مناسبت سے ۱۹۹۴ء میں پیکنگ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر مظفر بختیار کو پروفیسر امریطس پکن یونیورسٹی کا درجہ مخصوص منشور و اعزاز کے ساتھ عطا کیا گیا۔ پکن یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ اعزاز پہلی مرتبہ ایک غیر ملکی استاد کو حاصل ہوا۔

اس کتاب کے انتشار سے پہلے غیر ملکی کتاب شناسوں کے علاوہ، چینی محققین بھی عربی و فارسی خطی نسخوں بلکہ چین کی وسیع سرزمین میں ان مراکز و مقامات سے بھی ناآشنا تھے جہاں یہ نسخہ موجود ہیں۔

فارسی خطی نسخوں پر تحقیق و تعارف وہ بھی ایک ایسی وسیع سرزمین میں جہاں کسی قسم کی فہرستِ کتب و کتاب شناسی دستیاب نہ ہو۔ ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور اتنی آسانی سے انجام نہیں پاتا۔ فاضل مؤلف نے مقدمہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک غیر ملکی محقق کے لیے اس ذاتی دانش و علمی استعداد، کتاب شناسی و نسخہ شناسی کے فنی مسائل پر کامل دسترس اور چین کی ثقافت سے آشنائی کے علاوہ لازم ہے کہ وہ نسخہ کے حصول کے لیے مختلف مناطق، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کا سفر کرے اور ذاتی طور پر براہِ راست نسخوں کا مشاہدہ کر کے تحقیقی کام انجام دے۔ خود مؤلف نے اسی وجہ سے تمام نسخوں کے حصول و تعارف کے لیے سراسر چین میں دو سو سے زیادہ شہروں، قصبوں اور دور افتادہ دیہاتوں کا سفر کیا اور نزدیک سے نسخوں کو دیکھا اور مطالعہ و تحقیق کی ہے۔

اس سروے کے مطابق چین میں موجود خطی نسخے قرآن کریم کے قدیم ترجموں، نظم و نثر ادب فارسی و عرفان کے مختلف متون جن میں بعض نہایت نفیس اور منحصر بہ فرد شمار ہوتے ہیں۔ ڈکشنریوں، دستور زبان و فارسی زبان کی آموزشی نیز علوم نجوم و طب... وغیرہ کی کتابوں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں فارسی کے بعض ایسے متن بھی متعارف کرائے گئے ہیں جو چین میں متداول تھے اور ایران اور دوسرے غیر ممالک میں یہ کتابیں ہیں، جیسے کتابِ مواعظ، مخمس تبادکانی، کتاب ذاشیہ، شرح اربعین، قندیل نامہ اور ادبی و عرفانی متون کی فارسی شرحوں کے کچھ مجموعے۔ اس سروے کا سب سے زیادہ جالب توجہ کام چین میں تفسیر ابوعلی جبائی کے متن کی یافت اور شناخت ہے۔ اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کتاب ضائع ہو چکی ہے۔

اس کتاب میں کتاب شناسی کے مطالب و موضوعات کے علاوہ چین اور ایران شناسی کے دیگر مباحث کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے چین میں فارسی زبان کی تاریخ معتبر چینی منابع و ماخذ سے بیان کی ہے اسی طرح چین میں قدیم و جدید صوفی فرقوں مثلاً

نقشبندیہ، کبرویہ، قادریہ اور جذبیہ کے متعلق نادر اطلاعات اور ان کے درمیان فارسی عرفانی متون کا رواج۔ اب تک بالکل نئی اطلاعات ہیں جو چین اور ایران شناسی کی مختلف تحقیقی زمینوں میں قندیلِ راہ ہیں۔

یہ کتاب ان چینی خطی نسخوں اور کتابوں کے تعارف کی وجہ سے بھی سود مند ہے جو ایران شناسی سے متعلق ہیں جیسا کہ چینی زبان اور خط میں سات جلدی تفسیر Landian Changsi، جو کہ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل کے نفیس چینی متون میں شمار ہوتی ہے (ص ۸۴)۔ یا نیشنل لائبریری چین میں Hui rui yao fang (ص ۸۵) جو ایرانی طبیبوں کے چینی زبان میں ترجمہ شدہ نسخوں کا مجموعہ ہے۔ اس نسخے کے آخر میں جڑی بوٹیوں اور دواؤں کی فارسی۔ چینی لغت دی گئی ہے۔ جو دونوں زبانوں میں زبان شناسی کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔

دورہ تانگ (۶۱۸ - ۹۰۷ عیسوی) کے ایرانی نژاد ڈاکٹر و چینی شاعر لی شون کی کتاب Hai yao bencao کے تعارف میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کتاب کے نام کے معانی "گیاہانِ دریائی" (سمندری جڑی بوٹیاں) ہیں اور اسی طرح انگریزی زبان و دیگر مغربی منابع و ماخذ میں بھی Sea he rbs ترجمہ ہوئی ہے، جو غلط ہے۔ چونکہ کلمہ "hai" قدیم چینی زبان میں درآمداتِ دریائی (شاہراہِ ریشم دریائی) کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا اور اس کا دُرست اور دقیق عنوان "دریائی راستہ سے آنے والی جڑی بوٹیاں" اور دوسرے لفظوں میں "ایرانی جڑی بوٹیاں" ہوگا۔ (ص ۶۸)

اس کتاب میں انیسویں صدی کے اواخر میں چین میں نفیس فارسی خطی نسخوں کے گوناگوں حوادث کی وجہ سے ضائع ہو جانے اور غیر ملکی ماہرین آثارِ قدیمہ کے توسط سے چین کے بہت زیادہ ثقافتی ورثے و آثار کے خارج از کشورِ چین جانے کے اسباب پر بھی تحقیق کی گئی ہے مؤلف اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "Xikeqin کے علاقے شین جیانگ میں ایک بوڑھے آدمی کے بقول جو غیر ملکی ماہرین آثارِ قدیمہ کے ساتھ کام کرتا تھا، بہت سے لوگ اپنے خطی نسخے بیچنے کے لیے غیر ملکی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے پاس آتے تھے اور یہ ماہرین فارسی زرنگار اور تصویردار کتابوں میں خصوصی دلچسپی لیتے اور خرید کر ساتھ لے جاتے تھے۔" (ص ۶۹)

چین کی بڑی بڑی لائبریریوں اور بڑے شہروں میں موجود کمیاب اور نفیس خطی نسخوں کے علاوہ کتاب مذکور میں کئی دیگر مطالب اور اطلاعات بہت زیادہ جالبِ توجہ ہیں۔ مثلاً صوبہ Gansu کے ایک دور افتادہ چھوٹے گاؤں Dawantou میں معروف ایرانی عارف شیخ عبدالقادر گیلانی کی مثالی قبر اور کبرویہ فرقہ کی ایک بڑی خانقاہ موجود ہے۔ اس خانقاہ میں فارسی دیوانوں اور عرفانی متون کا ایک مجموعہ اور ایک پرانا شجرہ نسب طومار کی شکل میں دو میٹر لمبا موجود ہے۔ (۹۰-۸۹)

صوبہ Sichuan کے ایک گمنام گاؤں Taqiao میں قرآنِ کریم کا پوری دنیا میں ایک کمیاب ترین نسخہ خطی ۲/۵۰۲ سینٹی میٹر کے سائز اور صرف ۵ گرام وزن اور بہت ہی منفرد خط میں ایک بوڑھے مسلمان کے پاس موجود ہے۔ (ص ۱۰۸)

کاشغر شہر میں قدیم طرز کا پرانی کتاب فروشوں کا بازار موجود ہے۔ اور فارسی کے پرانے خطی نسخوں اور کتابوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ (ص ۹۶)

چین کے شمال میں Xaionan گاؤں میں بابا حمزہ اصفہانی کی آرام گاہ جو چین کے شمالی ترین علاقے کی Heilongjiang عمارتوں میں سے ہے، کتاب صفوۃ العادی، فارسی زبان کے دستور پر موجود ہے۔ (۶۴)۔

شہر Tianjin کی لائبریری میں ایک قدیم رسالہ آداب مشق اور فارسی خوشنویسی پر دستیاب ہوا ہے۔ (۱۰۸)

فلات پامیر کی بلند ترین پہاڑی چوٹیوں کے ضلع تاشقورغان کے ایک چھوٹے گاؤں Seyyed efdeh میں فارسی رسالہ قندیل نامہ کے متعلق مؤلف نے جالب توجہ توضیح دی ہے۔(۱۰۴)

اور آخر میں صحرائی صوبوں Qingrai, Gansu Ningxia، مغولستان چین اور شہرِ ختن میں بوستان و گلستانِ سعدی دیوان حافظ مثنوی و شرح مثنوی مولوی، جامی کے گوناگوں آثار، تذکرۃ الاولیا عطار اور مرصادالعباء نجم الدین رازی کے قدیم نسخے دیکھے جاسکتے ہیں۔

الغرض "World Survey of Islamic Manuscripts" چین اور ایران شناسی کے موضوع پر بنیادی ترین اور کامیاب ترین تحقیق ہے اور اس موضوع کے اہم مراجع اور ماخذ میں شمار ہوتی ہے۔

کتاب کی عمومی اور مجموعی روش کے لحاظ سے چونکہ سوائے ایک نمونہ خط Xiaoerjing کے چینی خطی نسخوں کے عکس نہیں چھاپے گئے اس لیے چینی کاتبوں اور رو نویسوں کے لکھے ہوئے خطی نسخوں کے عکس جو چینی خطی نسخوں کی کیفیت کے حاکی ہیں ضمیمے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

حواشی:

(۱) یہ تبصرہ "مجلہ کلک" شمارہ ۸۸-۸۵ فروردین- تیرماہ ۱۳۷۶ ش میں فارسی زبان میں شائع ہوا۔ (مترجم)

(۲) استاد، تہران یونیورسٹی، ایران (مترجم)

(۳) معروف ایرانی دانشور، شاعر و ادیب اور تہران یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد۔ (مترجم)

چینی لوک کہانیاں

از

شفیع عقیل

قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان

ڈی، ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی-۷۵۳۰۰

کتاب کے سرورق کا عکس

WORLD
SURVEY OF ISLAMIC MANUSCRIPTS
Volume IV

Al-Furqān Islamic Heritage Foundation

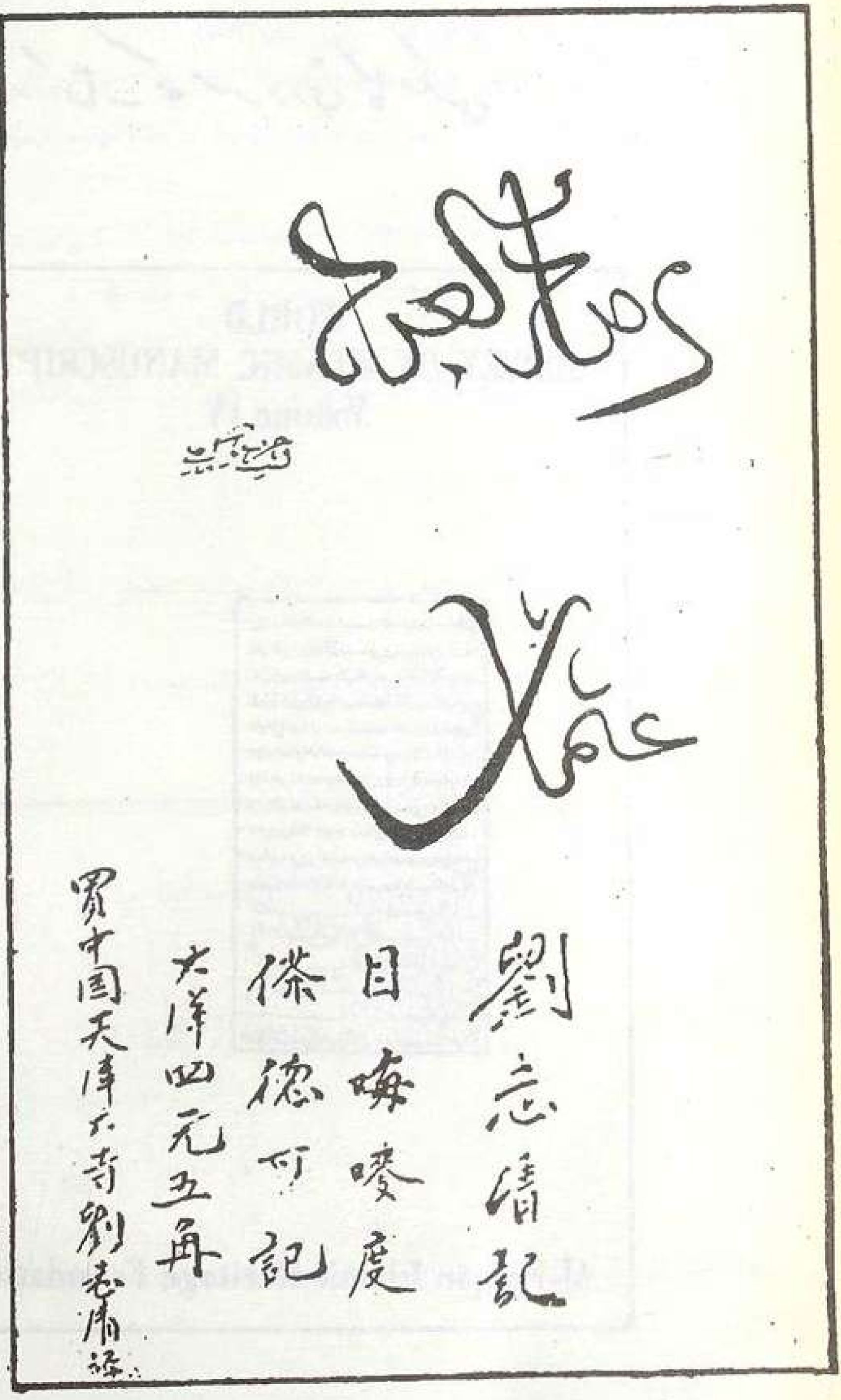

نجم الدین رازی کی
مرصاد العباد کے
قدیم ترین خطی نسخے
طغرہ اول کا عکس،
جس کے ساتھ چینی
خوشنویسی کا نمونہ
بھی نمایاں ہے۔
یہ نسخہ Tianjin
شہر کی ایک مسجد
میں محفوظ ہے۔

و بیان الفقر سواد الوجه فی الدارین و ترجیح فقر بر غنا عشق ...

محبت که طالب طرفین عاشق و معشوق است سلطنت و استغنای معشوق

دادن بعاشق و مذلت و افتقار بعاشق نه معشوق زیرا که عاشق را

از جهت عاشقی ناچار است از شعور بجمال معشوق و میل بان و طلب

وصول بان و رنج تنهائی از وصل و استمرار وصول بعد الحصول و دفع

تزاحم در آن و این همه افتقار است و افتقار مایه مذلت و اما معشوق

اگرچه در ایشان بجهت معشوقی محتاج است بعاشق اما و شاید که

وی را شعور بان نباشد اگر باشد طالب وجود زیبائی او نباشد پس وی را حق

هیچ معشوق هیچ نوع حاجت که موجب تذلل باشد نیست و اکثر وی را

بر فنا شعور بحسن معشوق باشد و ابتلای انبیا و اهل وجد و رنج بلا

مذلت کشد از آن حیثیت روی عاشق همواره هست بوجه نه بمعشوق و آن مذلت

از جهت عاشقی خواهد کشید نه از معشوق زیرا که ... ادا نیست که مثله

لازم عاشق است نه معشوق زیرا که عاشق ... عز و غنا ...

بسم الله الرحمن الرحیم

بنام خدای بخشاینده مهربان

منت خدای را عز و جل که طاعتش موجب قربتست و بشکر اندرش مزید نعمت

هر نفسی که فرو میرود ممد حیاتست و چون بر می آید مفرح ذات پس

در هر نفسی دو نعمت موجودست و بر هر نعمتی شکری واجب آید

از دست و زبان که بر آید کز عهده شکرش بدر آید

قوله تعالی اعملوا آل داود شکرا و قلیل من عبادی الشکور شعر

بنده همان به که ز تقصیر خویش عذر بدرگاه خدای آورد

ورنه سزاوار خداوندیش کس نتواند که بجای آورد

باران رحمت بی حسابش همه را رسیده و خوان نعمت بی دریغش همه جا کشیده

پرده ناموس بندگان بگناه فاحش ندرد و وظیفه روزی ایشان بخطا

منکر نبرد شعر

ای کریمی که از خزانه غیب گبر و ترسا وظیفه خور داری

دورۂ ہینگ کا گلستان سعدی کے خطی نسخے کا صفحۂ اول ۔ یہ نسخہ اپنی تاریخ کتابت کے لحاظ سے قدیم ترین نسخہ شمار ہوتا ہے ۔

بسم الله الرحمن الرحیم
سبح اسم ربک الاعلی
الذی خلق فسوی والذی
قدر فهدی والذی اخرج
المرعی فجعله غثاء احوی

دورہ یوانگ کا چینی اسلوب میں خطِ ریحان میں قرآن مجید کا ایک ورق

北京大學

PEKING UNIVERSITY

۱۵، ۲، ۱۳۷۶

جناب آقای دهباشی

سردبیر ارجمند مجلهٔ کلک

باسلام و آرزوی تندرستی و کامیابی جناب عالی و خوشوقتی از آشنائی و دیدار شما همانطور که پیشنهاد فرمودید پیش از بازگشت به چین مقالهٔ معرفی بررسی نسخه های خطی فارسی در چین را نوشتم و اکنون همراه با تصویر چند برگ نسخهٔ خطی خدمتتان تقدیم می دارم

امیدوارم فرزند دوست داشتنی و نازنینتان شهاب همواره کامیاب و خوشبخت باشد

با خداحافظی و آرزوی موفقیت و شادکامی

تن هوی جو

مجلہ کلک کے ایڈیٹر کے نام خانم تنگ ھوی جو کے خط کا عکس

جدیدیت اور مابعد جدیدیت

پروفیسر نظیر صدیقی

اردو میں فلسفیانہ تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض لوگ تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی باز نہیں آتے کہ اردو ادب میں خود تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ انتہا پسندانہ بیانات سے قطع نظر اتنا مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اردو ادب میں ابھی تک بہت سی چیزوں کی کمی ہے جو رفتہ رفتہ پوری ہوتی جارہی ہے۔

ضمیر علی بدایونی کی تصنیف، "جدیدیت اور مابعد جدیدیت" کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ضمیر علی کو اردو شعروادب اور مغربی فلسفے کے انھی حصوں سے زیادہ دلچسپی رہی جو ۱۹۲۵ء کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز انھی موضوعات پر مضمون نگاری سے کیا جو جدید ادب اور جدید فلسفے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قمر جمیل نے ضمیر علی اور ان کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ایک نہایت بلیغ عنوان ادب میں جدید معنویت کی تلاش، اختیار کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ ایک نہایت عمدہ تعارف لکھا ہے۔ شاید اُن سے بہتر لکھنا کسی اور کے لیے ممکن نہ تھا۔ قارئین کو یہ بات ان کے تعارف کے ذریعے پہلی مرتبہ معلوم ہوگی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ضمیر علی جوان تھے اس وقت بھی ان کے مضامین فرانسیسی میں ترجمہ کیے جاتے تھے اور ڈاکٹریٹ کرنے والے لوگ اپنے مقالوں میں ان کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ ان کا مضمون میراجی اور اشاریت، (cytolism مراد ہے) بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کا مضمون "اقبال وجودیوں کے درمیان" مرعوب کن ثابت ہوا۔ کراچی میں کامیو اور کافکا کا چراغ انھوں نے ہی جلایا۔ کامیو اور کافکا کے علاوہ انھوں نے ایبسرڈ تھیٹر، خالی کرسی اور آئنسکو وغیرہ جیسے موضوعات سے اردو قارئین کو متعارف کرایا۔ بقول قمر جمیل بلیک کامیڈی یا لایعنی تھیٹر اور ساختیات جیسے موضوعات نے ان کی بدولت اردو میں قدم رکھا۔ بقول قمر جمیل نثری نظم پر لعنت بھیجنے والے ہزار تھے اور سمجھنے والا صرف ایک ضمیر علی بدایونی تھا اور اب بھی ضمیر علی بدایونی ہے۔ نثری نظم کے سلسلے میں نوجوانوں کو زیادہ تر معلومات ضمیر علی بدایونی نے فراہم کیں۔ اردو ادب میں ہائیڈیگر اور سارتر جیسے فلسفیوں سے دلچسپی کا آغاز بڑی حد تک ضمیر علی کی وجہ سے ہوا۔ اس زمانے میں حسن عسکری بعض فرانسیسی اور مغربی ناول نگاروں اور شاعروں کو اردو میں ادبی سطح پر مقبول بنا رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کی دھاک زیادہ تھی۔ ان سے بڑا مغربی ادب کا عالم نہ تھا نہ ہے اور نہ ایک مدت تک ہوگا۔ ضمیر علی اپنی مختلف الجہات خدمات کے باوجود عام شہرت کے مالک نہ تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت کرتے ہیں۔

جدید ادب (مغربی اور اردو ادب دونوں) اور جدید فلسفے سے اپنی دلچسپی کے زیرِ اثر وہ ایسے مضامین لکھتے رہے ہیں جن کے

موضوعات و مباحث میں انھوں نے جدید ادب کی تحریکات، رجحانات اور ان پر عہد حاضر کی اثرانداز ہونے والی شخصیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ مثلاً ادب میں وجودیت کی تحریک، سارتر شعور سے بشعور تک، سارتر حقیقت سے ایمج تک، ہیڈیگر زندہ خداؤں کے سرد کناروں پر، لایعنی تھیٹر... خالی کرسی، کافکا کا نظریۂ فن، گردشِ رنگ متن (رولاں بارتھ) ساسیئر کے لسانی افکار، لیوی اسٹراس کے بنیادی افکار، ساسیئر، فرائڈ سنگم لاکاں کی دریافت، مظہری ساختیات (ایڈمنڈ ہرآج مظہری تنقید رد تشکیل کے آئینے میں (دریدا) ساختیاتی فکر کا عروج و زوال، پس ساختیات پر ہیڈیگر کے اثرات، مصنف کی موت کا تصور، ضمیر علی بدایونی نے لگے لپٹے مسائل کو اپنے مضامین میں سمیٹ لیا ہے اور بہت سی ادبی اور فلسفیانہ شخصیتوں کے Contributions کی طرف اشارے کیے ہیں۔ وہ اگر چاہتے تو اس کتاب کے موضوع یا موضوعات پر ایک سیر حاصل کتاب لکھ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے بوجوہ اختصار کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور حافظہ قوی ہے۔ انھیں صاف ستھری نثر لکھنا آتی ہے۔ نتیجتاً ان کی یہ کتاب بہت ہی معلومات افزا، خاصی بصیرت افروز اور بڑی حد تک دلچسپ ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کتاب اپنے ہر باب کے موضوع کا واضح تصور پیدا نہیں کرتی۔ اسے پڑھ کر یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور رد تشکیل وغیرہ کے تصورات سے واقف ہو گئے کیونکہ ان ادبی اور فلسفیانہ موضوعات کے ساتھ عہد حاضر کی ادبی اور فلسفیانہ تنقید میں ایک خاص قسم کا ابہام آگیا ہے جس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ آج کی تنقید میں ہر قدم پر نئی اصطلاحات کی بھرمار ہے جن کی تعریف و توضیح سے لکھنے والا گریز کرتا ہے۔ ضمیر علی بدایونی تک نے ایک جگہ لاکاں کا ساختیاتی ماڈل کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ:

"لاکاں کا ساختیاتی ماڈل کیا ہے یہ ایک طویل اور پیچیدہ بحث ہے جس پر آئندہ کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔ نہ جانے ضمیر علی نے اس ضروری کام کو کتنی مدت کے لیے معرض التوا میں ڈال دیا ہے۔"

بعض اوقات ابہام کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی کا قول سیاق و سباق کے بغیر بیچ سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ مثلاً بودلیر نے کہا تھا کہ تخیل نے کائنات کی تخلیق کی ہے؟

نئے فلسفے کے ناقابلِ فہم یا دشوار فہم ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نیا فلسفہ منطق سے زیادہ شاعرانہ زبان میں لکھا گیا ہے مثلاً ہیڈیگر سے متعلق باب یوں ختم ہوتا ہے۔ ہیڈیگر کا تصور انسان معنی کا التباس نہیں معنی کا انتظار ہے:

اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

ہیڈیگر مایوس نہیں ہے بلکہ وہ زندہ خداؤں کے سرد کناروں پر کھڑا ہوا ہے؟ زندہ خدا کون ہیں؟ اور ان کا سرد کنارہ کیا چیز ہے؟ نئے فلسفے کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ابہام کے دریا میں تیر رہے ہیں۔ کسی بات کی کوئی قطعی بنیاد نہیں ملتی۔ کسی دعوے کا کوئی واضح تصور ذہن میں قائم نہیں ہوتا۔ غالب کے اس شعر کی بجائے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کا یہ شعر یاد آتا رہتا ہے:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اب سے پہلے ادبی تحریکات کو اتنی فلسفیانہ توجہ کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس توجہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ادب پر نہ صرف فنی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بحث ہوتی رہی ہے بلکہ خود انسان اور انسانی زندگی بلکہ انسانی موت کے بارے میں بھی بڑے بڑے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

ضمیر علی بدایونی نے فانی اور ہیڈیگر کا تصور مرگ کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا ہے جس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ فانی کے المناک وژن کو سمجھنے اور ان کے المناک وژن کی فلسفیانہ اور شاعرانہ قدر و قیمت مقرر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فلسفی اور شاعر دونوں طبقے صاحب بصیرت اور صاحبِ وجدان ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا وجدان حقیقت کو چھولیتا ہے۔ لیکن یہ دونوں طبقے خیال آرائی سے بھی تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کا وژن زیادہ قابلِ اعتماد نہیں کہا جا سکتا۔ شاعر تو خیر حقیقت حال سے زیادہ حسن خیال کی تلاش میں رہتا ہے۔ خود فلسفیوں کو حسن توجیہ اور حسن تاویل کا شوق کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ ہیڈیگر نے انسان کو "ہستی سوئے مرگ" قرار دیا ہے ہستی سوئے مرگ کا ٹکڑا سننے میں اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کسی حقیقت تک راہنمائی نہیں کرتا۔ میر نے موت کو ایک ماندگی کا وقفہ کہا ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ موت کے بارے میں یہ ایک حوصلہ افزا تصور ہے لیکن اس تصور کی بنیاد کسی ٹھوس علم یا حقیقت پر نہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ:

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ موت غم سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن یہ بات غالب کو کہاں سے معلوم ہو گئی اگر موت کے بعد پھر کسی زندگی سے سابقہ ہے تو کون جانتا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی اور زیادہ ہولناک اور اذیت ناک ہے کہ نہیں البتہ فانی نے اپنے اس مصرع میں ایک گہری حقیقت کا اظہار کیا ہے:

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

اور غالب کا یہ مصرع انسانی زندگی کے المیے کو چھولیتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

میں نے بہت سے بداعمال لوگوں کو اس خیال سے مطمئن پایا ہے کہ اللہ صرف قہار و جبار نہیں رحیم و کریم بھی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت کہ اس کی رحیمی و کریمی کا اظہار ہمیں پر ہو گا۔ اگر خدا انصاف پسند بھی ہے تو ایک بداعمال اور بد کردار شخص پر اس کی انصاف پسندی اور رحیمی و کریمی کا استعمال کس حساب سے ہو گا۔ کیا وہ ایک بڑے گناہ گار یا ایک پیشہ ور قاتل کو صرف اس لیے معاف کر دے گا کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے۔ گناہ گار کے ہاتھوں جو معصوم زندگیاں تباہ و برباد ہوئیں اور پیشہ ور قاتل کے ہاتھوں جو بے قصور لوگ ہلاک ہوئے ان کے ساتھ انصاف کس طرح ہو گا۔ غالباً انسان پر خالق کائنات کا سب سے بڑا کرم یہ ہوتا کہ وہ انسان کو پیدا نہ کرتا۔ انسان کی تخلیق نے دنیا کو "Absurd theatre" بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی دنیوی زندگی میں آخرت کی تیاری کرنی چاہیے جبکہ انسان کا حال یہ ہے کہ دنیا میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دنیوی مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہو اور اگر نہ ہو تو زندہ کس طرح رہے۔ دنیا میں انسان کی Survival اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کی سنگینی کو محسوس کرنے کے لیے سعدی کے دو شعروں کو سامنے رکھنا کافی ہو گا:

ہمہ روز اتفاق می سازم
کہ بہ شب باخدائے پردازم

ترجمہ:

تمام دن میں یہ نیت کرتا ہوں، کہ رات کو خدا کی عبادت میں مشغول ہوں گا۔

شب چو عقد نماز بر بندم
چہ خورد با مُداد فرزندم

ترجمہ:

رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں، تو یہ خیال آتا ہے کہ صبح کو بچے کیا کھائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر انسان کو آخرت کی تیاری کی مہلت بالکل نہیں ملتی۔ اس تیاری کے سلسلے میں نہ صرف نماز جیسا فرض نظر انداز ہو جاتا ہے بلکہ اور بے شمار فرائض ناقابلِ ادا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سی برائیوں کا ارتکاب تک ناگزیر ہو جاتا ہے۔

میں اس مضمون کے بنیادی موضوع سے دیر تک اور دور تک تجاوز کر گیا۔ لیکن میرے تجاوزات بالکل غیر مربوط (Irrelevant) بھی نہیں ہیں۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ فلسفیوں اور شاعروں کے خیالات و نظریات کو بھی اتنی ہی اہمیت دینی چاہیے جتنے کے وہ مستحق ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہائیڈیگر جیسے مفکر اور غالب جیسے شاعر کی ہر بات حقیقت کی کسوٹی پر پوری اترے۔ ذوق، غالب کے مقابلے میں بہت چھوٹے شاعر ہیں لیکن ان کا یہ شعر:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب کے اس مشہور و مقبول شعر سے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کئی گنا بڑا شعر ہے۔

آخر میں ضمیر علی بدایونی سے ایک گزارش یہ کرنی ہے کہ ان کی زیرِ بحث کتاب قمر جمیل جیسے پڑھے لکھے ذہین قاری کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن اردو پروفیسروں کے لیے جب تک وہ نصابی سطح پر ایسی کتاب نہیں لکھیں گے اردو کے پروفیسر حضرات فیضیاب نہیں ہو سکیں گے۔

جمیل الدین عالی کی انجمن ترقی اردو سے
بطور معتمد اعزازی چالیس سالہ رفاقت

ادیب سہیل

بارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء تک، انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ڈاکٹر جمیل الدین عالی کے تعلق کو تقریباً چالیس سال ہوتے ہیں۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے زمانے ہی میں مولوی صاحب نے انجمن کی نئی مجلسِ نظما کے لیے جناب جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر ریاض الحسن کو نامزد کیا تھا۔ انجمن کی نئی مجلسِ نظما کے قیام کے بعد اسی دور میں نیا دستور انجمن رقم کیا گیا۔

اگست ۱۹۶۱ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا اور ۱۹۶۲ء میں جناب جمیل الدین عالی انجمن کے معتمد اعزازی مقرر ہوئے اور تب سے تاحال وہ اس اعزازی عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انجمن کے دونوں کالجوں (یعنی وفاقی اُردو کالج اور اُردو سائنس کالج) کے معتمدِ اعزازی بھی رہے۔ یہ سلسلہ تعلیم کے قومیائے جانے تک یعنی ۱۹۷۳ء تک برقرار رہا۔

۱۹۶۲ء سے تاحال جناب جمیل الدین عالی کی خدمات انجمن ترقی اُردو پاکستان کے لیے بہ حیثیت معتمد اعزازی کثیر اور بے شمار ہیں۔ اس طویل عرصے میں اُنھوں نے انجمن کے تین صدور جناب اختر حسین، جناب قدرت اللہ شہاب اور جناب نورالحسن جعفری کے عہد دیکھے۔ آج کل انجمن کے صدر اعزازی کے عہدے پر جناب آفتاب احمد خاں فائز ہیں۔

اس دوران میں انجمن کے لیے نئی عمارت D-159 بلاک 7 گلشن اقبال میں خریدی گئی اور انجمن اپنے شعبۂ تحقیق اور کتب خانہ خاص و عام کے ساتھ پرانے دفتر واقع بابائے اُردو روڈ سے منتقل ہو کر یہاں نئی عمارت میں آگئی اور پرانا دفتر جس کا اختصاص یہ ہے کہ وہاں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا مزار ہے اس کا ہال دوبارہ تعمیر و مزین کرنے کا منصوبہ ہے۔ عمارت کے چند حصے انجمن کی مطبوعہ کتب کے دفتر اور گودام کے طور پر کام آرہے ہیں۔

جرائد

انجمن کے ماہنامہ اور سہ ماہی جریدوں "قومی زبان" اور "اُردو" اور دیگر مطبوعات کے سلسلے میں کتابت کے لیے اب تک خوش نویسوں پر انحصار کیا جاتا تھا۔ اِن کی جگہ لیزر کمپوزنگ کا جدید نظام اپنایا گیا ہے۔ اِس کام کے لیے کمپیوٹر کا مکمل نظام رائج ہے۔ انجمن کے رسائل و کتب اِسی سے کمپوز ہو کر اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔

تمغہ زریں

اسی دور میں بابائے اردو گولڈ مڈل سندھ کی مختلف یونی ورسٹیوں کے اُن طلبہ کو اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں دینے کا آغاز کیا گیا جو شعبۂ اُردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقسیم انعامات کا کام بہ فضلہ بہت ہموار طریقے سے جاری ہے۔

توسیعی خطبات

اسی دور میں صدر انجمن جناب اختر حسین مرحوم کے ایما پر سالانہ، بابائے اُردو یادگاری لکچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کا جلسہ ہر سال اگست کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے مشاہیر ادبا انجمن کی جانب سے دیے گئے کسی خاص موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہیں جو اکثر ساتھ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ سب سے پہلا مقالہ "محمد تقی میر" ڈاکٹر جمیل جالبی نے یادگاری لکچر کے لیے تحریر کیا، بعدازاں اندرون ملک کے ڈاکٹر ریاض الحسن، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، عزیز حامد مدنی، ڈاکٹر آفتاب احمد اور بیرون ملک کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر رالف رسل، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر نورالحسن نقوی اور کئی دوسرے مشاہیر کے گراں قدر لکچروں سے کراچی کے ادب دوست سامعین اور قارئین کو مستفید ہونے کا موقع فراہم ہوا۔ یہ خطبے شائع بھی کیے جاتے ہیں اس طرح ان کا فیض عام قاری تک بھی پہنچتا ہے۔

اسی دور میں علاقائی ادیب و ادب کے تعارف کے لیے خاص اقدام کیا گیا۔ ایک طرف علاقائی زبانوں کی شعری و نثری تخلیقات کو منتخب کر کے انھیں کتابی صورت میں شائع کیا گیا، دوسری طرف ان علاقوں کے مشاہیر ادیب و شاعر و نقاد حضرات کے ساتھ خاص تعارفی تقاریب کے اہتمام کیے جاتے رہے۔ جن میں اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں نشانِ سپاس پیش کیے گئے اور اُن پر مضامین پڑھوائے گئے۔

پذیرائی و نشان سپاس

قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانوں کے ادبا و شعرا جن کی پذیرائی کا انجمن نے وقتاً فوقتاً اہتمام کیا اُن میں میر مٹھا خان، امیر حمزہ شنواری، غلام مصطفےٰ قاسمی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، شریف کنجاہی وغیرہ ہیں۔ علاوہ بریں اردو کے حوالے سے جن کی پذیرائی ہوئی اُن میں احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، ممتاز مفتی، شہید حکیم محمد سعید، حمید نسیم، جلیل قدوائی، ضمیر جعفری اور پروفیسر ممتاز حسین کے نام نامی ہیں۔

بیرون ملک کے مشاہیرِ علم و ادب میں ڈاکٹر رالف رسل، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، محترمہ کرسٹینا ہلڈ اور فرانس پریچٹ کے علاوہ چینی ادیبوں کے کئی وفود اور ان گنت جاپانی و ہندوستانی ادبا انجمن کے مہمان بنے۔

چند مطبوعات

"فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" شائع کی گئیں، جن میں ہزاروں بینکاری کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ یہ کام معتمد اعزازی کی سرکردگی میں ماہر معاشیات اور بزرگ ادیب محمد احمد سبزواری نے انجام دیا ہے۔ اس مختلف نوعیت کی کتاب کی پذیرائی اور تعارف کے لیے ایک نہایت پروقار اور شایانِ شان تقریب انجمن کی طرف سے منعقد کی گئی جس کے مہمانِ خصوصی کے لیے بہ طور خاص

اسٹیٹ بینک کے گورنر جناب محمد یعقوب مدعو ہوئے۔

اسی دور میں پہلی بار اردو انگلش لُغت شائع ہوئی مزید برآں ساڑھے تین ہزار اضافی الفاظ کے ساتھ اسٹینڈرڈ انگلش اُردو لغات کی دو اشاعتیں: ایک ۱۹۶۸ء میں اور دوسری ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئیں۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ لُغت کے باب میں ایک اور کارنامہ ہوا، یعنی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری پندرہ ہزار نئے الفاظ کے ساتھ تیاری کے مراحل میں ہے۔

اقامتی جامعہ اردو

یہ بات کم لوگوں کے علم میں ہے کہ پاکستان میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کی ضرورت کو پہلے پہل انجمن ترقی اردو پاکستان نے محسوس کیا تھا۔ اردو یونی ورسٹی کا قیام بابائے اردو مولوی عبدالحق کا دیرینہ خواب ہے۔ اس حوالے سے ۱۹۶۴ء میں اس منصوبے کا آغاز اردو سائنس کالج کی نئی عمارت (گلشن اقبال، کراچی) سے ہوا، جس کے لیے اختر حسین صاحب مرحوم کی رہنمائی میں عالی صاحب نے سخت کاوش کی۔ اس میں ۱۹۶۸ء تک کئی سو طلبہ و طالبات کی تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ عالی صاحب ۱۹۶۷ء میں چین گئے تو وزیر اعظم چواین لائی کی خاص توجہ سے لیبارٹری کے لیے ساڑھے چھ لاکھ کا سامان آسان قرض پر کالج کے لیے لے آئے۔ پانچ مضامین میں ایم۔ایس۔سی تعلیم و امتحان کی اجازت جامعہ سے لی گئی۔ تعلیم ۱۹۷۳ء میں قومیائی گئی اور وہاں اقامتی اردو یونی ورسٹی قائم کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی اور بطور خاص تین سال میں اُنھوں نے جامعہ کا تفصیلی خاکہ وفاقی حکومت کو پیش کر دیا ہے۔

حالیہ دنوں میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کی خواہش کو جو مہمیز لگی ہے اور جس کے لیے مختلف اردو دوست ادارے کوشاں ہیں، وہاں بھی انجمن پیش پیش ہے، اس کے لیے جو سہ رکنی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اُس میں انجمن کے صدر جناب آفتاب احمد خاں بھی شامل ہیں۔

انجمن ترقی اُردو کے معتمد اعزازی ڈاکٹر جمیل الدین عالی کی خدمات ادب کے فروغ کے سلسلے میں ہمہ جہت ہیں، اُن سب کے بیان کی سمائی کے لیے کوئی الگ مضمون درکار ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اُن کی ادب دوستی ہر سمت فعال رہی ہے اور اِس سلسلے میں کبھی چین سے نہیں بیٹھے۔

ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے اپنی معتمدی کی مدت یعنی ۱۹۶۲ء سے تاحال تقریباً ۱۵۵ کتب کے لیے "حرفے چند" تحریر کیے ہیں، کتابوں پر "حرفے چند" تحریر کرنے کی روایت بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے قائم کی۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ ذمے داری جناب جمیل الدین عالی پر آپڑی۔ جسے اُنھوں نے بہ احسن نبھایا ہے۔ جناب مشفق خواجہ نے "حرفے چند" جلد سوم کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے دیوقامت انشا پرداز کی روایت پر استقامت سے چلتے رہنا ہی ایک چیلنج تھا جب کہ بلاشبہ عالی نے اِس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ عالی نے جن کتابوں پر "حرفے چند" تحریر کیے ہیں، اُن میں سے بعض حال ہی میں میرے مطالعے میں آئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتاب کی اصل روح کیا ہے، اِس کے مندرجات میں کہاں کہاں کیسے کیسے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں اور عالمی تناظر میں ان ادبی مباحث کا کیا مقام ہے۔ "حرفے چند" لکھتے ہوئے جمیل الدین عالی کی جانفشانی محنت اور وسیع النظری کا قائل ہونا پڑتا ہے..."

جناب مشفق خواجہ دیباچہ نگاری کے حوالے سے عالی صاحب کو مولوی صاحب کا صحیح جانشین تصور کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے دیباچہ نگاری (بہ عنوان "حرفے چند") کے میدان میں تاحال عالی صاحب کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔

عالی صاحب نے ۱۹۶۲ء سے اب تک، یعنی چالیس سالہ مدت میں تقریباً تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتب پر "حرفے چند" لکھے ہیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ اسٹوڈینٹس اسٹینڈرڈ انگریزی۔ اردو ڈکشنری (ساتویں اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۲۔ سودا	سیخ چاند (مرحوم)
۳۔ سب رس (تیسری اشاعت)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۴۔ خطباتِ عبدالحق	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۵۔ مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد اوّل)	انجمن ترقی اردو پاکستان
۶۔ اسٹوڈینٹس اسٹینڈرڈ انگریزی۔ اردو ڈکشنری (آٹھویں اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۷۔ تذکرۂ اہل دہلی	سر سید احمد خاں
۸۔ محمد حسین آزاد حیات اور تصنیف (حصہ اول)	ڈاکٹر اسلم فرخی
۹۔ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو، (اردو) جلد اوّل	افسر صدیقی امروہوی و سید سرفراز علی رضوی
۱۰۔ پشتو شاعری	فارغ بخاری ارضا ہمدانی
۱۱۔ ہفت مقالہ	سید حسام الدین راشدی
۱۲۔ گلشنِ ہمیشہ بہار	نصر اللہ خاں خویشگی
۱۳۔ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (فارسی، عربی)	سید سرفراز علی رضوی
۱۴۔ ابیاتِ سلطان باہو	عبدالمجید بھٹی
۱۵۔ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (اردو)، جلد دوم	افسر صدیقی امروہوی
۱۶۔ اسٹینڈرڈ انگریزی۔ اردو ڈکشنری (دوسری اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۱۷۔ ننھی منی نظمیں	خاطر غزنوی
۱۸۔ غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین
۱۹۔ غالب نام آور	انتخاب مضامین سہ ماہی اردو
۲۰۔ فلسفہ کلامِ غالب	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۲۱۔ مہرِ نیمروز	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۲۲۔ ہنگامۂ دل آشوب	سید قدرت نقوی
۲۳۔ مقاماتِ ناصری	سید انصار ناصری
۲۴۔ پاپولر انگریزی۔ اردو ڈکشنری (تیسری اشاعت)	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۲۵۔ پنجابی کے پانچ قدیم شاعر	شفیع عقیل
۲۶۔ موج موج مہران	مراد علی مرزا/الیاس عشقی

۲۷- کدم راؤ پدم راؤ	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۸- لغتِ کبیر (جلد اوّل)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۲۹- انتخابِ جدید (حصہ اوّل) (پانچویں اشاعت)	پروفیسر عزیز احمد / پروفیسر آلِ احمد سرور
۳۰- اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی- اردو ڈکشنری (دسویں اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۳۱- طنزیات و مقالات	سید محفوظ علی بدایونی
۳۲- دیوانِ قاسم	محمد سخاوت مرزا
۳۳- قاموس الکتب جلد دوم، تاریخیات	انجمن ترقی اردو پاکستان
۳۴- تلخیصِ معلّیٰ	ڈپٹی کلب حسین خاں نادر
۳۵- تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر میرٹھی
۳۶- بیاضِ مراثی	افسر صدیقی امروہوی
۳۷- چینی لوک کہانیاں	شفیع عقیل
۳۸- تذکرۂ عروس الاذکار	افسر صدیقی امروہوی
۳۹- کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی	میر انشاءاللہ خاں انشا دہلوی
۴۰- اردو تھیٹر (جلد چہارم)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۴۱- فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں- جلد اوّل (دوسری اشاعت)	مولوی ظفر الرحمان صاحب دہلوی
۴۲- گلِ رعنا	سید قدرت نقوی
۴۳- سر سید احمد خاں، حالات و افکار (دوسری اشاعت)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۴۴- مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (جلد سوم)	افسر صدیقی امروہوی
۴۵- مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد دوم)	ڈاکٹر حمید اللہ
۴۶- پاپولر انگلش- اردو ڈکشنری (چوتھی اشاعت)	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۴۷- اشاریہ اردو	سید سرفراز علی رضوی
۴۸- افکارِ حالی	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۴۹- اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی
۵۰- تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر معین الدین عقیل
۵۱- مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (جلد چہارم)	افسر صدیقی
۵۲- دانائے راز، اقبال	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۵۳- سب رس (چوتھی اشاعت)	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۵۴- لغتِ کبیر اردو، جلد دوم، حصہ اوّل	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۵۵- شامِ غریباں	لچھمی نرائن شفیق
۵۶- افکارِ عالیہ	ڈاکٹر خان رشید

۵۷- انجمن کی اردو- انگریزی ڈکشنری	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۵۸- مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (جلد پنجم)	افسر صدیقی امروہوی
۵۹- مصطلحاتِ علوم و فنون عربیہ	محی الدین غازی اجمیری
۶۰- ماخذات، احوال شعرا و مشاہیر (جلد اوّل)	سرفراز علی رضوی
۶۱- عُقدِ ثریا	غلام ہمدانی مصحفی
۶۲- نلِ دمن	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
۶۳- اقبال	مولوی احمد دین / مشفق خواجہ
۶۴- قاموس الکتب اردو، عمرانیات (جلد سوم)	انجمن ترقی اردو پاکستان
۶۵- مولانا ظفر علی خاں، بحیثیت شاعر	نظیر حسنین زیدی
۶۶- جاپانی لوک کہانیاں	شفیع عقیل
۶۷- نساخ (حیات و تصانیف)	ڈاکٹر محمد صدرالحق
۶۸- اردو تنقید کا ارتقا (تیسری اشاعت)	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۶۹- انتخابِ جدید (حصہ دوم)	وزیر آغا / انور سدید / اسجد نقوی
۷۰- مضامینِ پریم چند	عتیق احمد
۷۱- سلہٹ میں اردو	محمد عبدالجلیل بسمل
۷۲- مکاتیبِ عبدالحق بنام محوی	عبدالقوی دسنوی
۷۳- مثنوی عاقبت بخیر	افسر صدیقی
۷۴- تہافتُ الفلاسفہ	امام ابو محمد غزالی
۷۵- اسٹینڈرڈ انگریزی- اردو ڈکشنری (تیسری اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۷۶- اسٹوڈینٹس اسٹینڈرڈ انگریزی- اردو ڈکشنری (گیارہویں اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۷۷- مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (جلد ششم)	افسر صدیقی امروہوی
۷۸- مشاہیر یونان و روما (جلد اوّل)	مولوی سید ہاشمی فرید آبادی
۷۹- دیوان تراب	ڈاکٹر سلطانہ بخش
۸۰- مثنوی نوسرہار	افسر صدیقی
۸۱- حدیقۃ الرام	سخاوت مرزا
۸۲- پاپولر انگریزی- اردو ڈکشنری (پانچویں اشاعت)	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۸۳- سب رس (پانچویں اشاعت)	بابائے اردو مولوی عبدالحق
۸۴- اردو فکشن، بنیادی و تشکیلی عناصر	اختر انصاری
۸۵- جمالیات اور اردو ادب	ریاض الحسن
۸۶- رسالۂ شکن، لولوئے از غیب	شیولال / ڈاکٹر محمد ایوب قادری

۸۷- منکرینِ اسلام	مولانا عبید اللہ قدسی
۸۸- سنگھاسن بتیسی	افسر صدیقی
۸۹- قہرِ عشق	شان الحق حقی
۹۰- انگریزی- اردو پاکٹ ڈکشنری (چوتھی ا	اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۹۱- اسٹینڈرڈ انگریزی- اردو ڈکشنری (چوتھی اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۹۲- انجمن کی اردو- انگریزی ڈکشنری (تیسری اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۹۳- اسٹوڈینٹس اسٹینڈرڈ انگریزی- اردو ڈکشنری (بارہویں اشاعت)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۹۴- اسلوبیاتِ میر	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۹۵- اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید
۹۶- غزل نما	ادا جعفری
۹۷- پاکستان میں اردو تحقیق	ڈاکٹر معین الدین عقیل
۹۸- قواعد صرف و نحو، زبان اردو	سر سید احمد خاں
۹۹- پاکستان کی کہانی بچوں کے لیے	بیگم سلمیٰ زمن
۱۰۰- چراغِ شناسائی	حنیف فوق
۱۰۱- ماخذات، احوال شعرا و مشاہیر (جلد سوم) (دوسری اشاعت)	سر فراز علی رضوی
۱۰۲- پاکستانی معاشرہ	اکبر ایس احمد
۱۰۳- ابن انشا، احوال و آثار	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض
۱۰۴- پنجابی زبان و ادب ایک جائزہ	حمید اللہ شاہ ہاشمی
۱۰۵- خطباتِ گار[illegible] (دوسری اشاعت)	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۱۰۶- فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں (دوسری اشاعت)	مولوی ظفر الرحمان صاحب دہلوی
۱۰۷- اردو تھیٹر (جلد چہارم)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۰۸- جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور	ڈاکٹر محمد ایوب قادری
۱۰۹- ماخذات (جلد اوّل)	سر فراز علی رضوی
۱۱۰- ماخذات (جلد سوم)	سر فراز علی رضوی
۱۱۱- کاروانِ صحافت (دوسری اشاعت)	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
۱۱۲- غالبِ آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد
۱۱۳- مولانا احسن مارہروی	ڈاکٹر صابر حسین خاں جلیسری
۱۱۴- مضامینِ اختر جونا گڑھی	قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی
۱۱۵- تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا
۱۱۶- غالب کے خطوط (جلد اوّل)	خلیق انجم

۱۱۷- اردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان	ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی
۱۱۸- مولانا صلاح الدین احمد	ڈاکٹر وزیر آغا/ڈاکٹر انور سدید
۱۱۹- سیف الملوک	شفیع عقیل
۱۲۰- جدید اردو شاعری	عزیز حامد مدنی
۱۲۱- دیوانِ غالب (کامل)	کالی داس گپتا رضا
۱۲۲- البیرونی (تیسری اشاعت)	سید حسن برنی
۱۲۳- مقالاتِ برنی (حصہ دوم)	سید حسن برنی
۱۲۴- داستانِ سحر البیان	میر غلام عشرت/ڈاکٹر احمد سجاد
۱۲۵- اردو قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۱۲۶- فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری	محمد احمد سبزواری
۱۲۷- مرقعِ اقوال و امثال	سید یوسف بخاری دہلوی
۱۲۸- مضامینِ غلام ربانی	غلام ربانی
۱۲۹- بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی
۱۳۰- جدید اردو شاعری (حصہ دوم	عزیز حامد مدنی
۱۳۱- مشاہیرِ یونان و روما	مولوی ہاشمی فرید آبادی
۱۳۲- وضعِ اصطلاحات (اشاعت ششم)	مولوی وحید الدین سلیم
۱۳۳- انتخابِ کلام ناسخ	رشید حسن خاں
۱۳۴- نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین
۱۳۵- غالب کا سائنسی شعور	ڈاکٹر سید حامد علی شاہ
۱۳۶- ہماری زبان، مباحث و مسائل	پروفیسر طاہر فاروقی
۱۳۷- سعید کی پراسرار زندگی	ایملی حبیبی/انتظار حسین
۱۳۸- اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ
۱۳۹- دیوانِ غالب کامل (اشاعت سوم)	کالی داس گپتا رضا
۱۴۰- مطالعہ عبدالحق	سید قدرت نقوی
۱۴۱- آزادی کے بعد اردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
۱۴۲- زبانِ واحد	میرین مولٹینو/اصفیہ صدیقی
۱۴۳- رباعیات عجائبات	امو جان ولی دہلوی
۱۴۴- اردو ادب کی تحریکیں (اشاعت سوم)	ڈاکٹر انور سدید
۱۴۵- اردو پاکستان کی قومی زبان	میاں بشیر احمد
۱۴۶- ہندی اردو لغت	راجہ راجیسور راؤ اصغر

۱۴۷- عالمی ادب سے خوب صورت نظموں کے ترجمے — ضمیر احمد
۱۴۸- خطوطِ عبدالحق بنام آل احمد سرور — پروفیسر آل احمد سرور
۱۴۹- سرسید احمد خاں- حالات و افکار — بابائے اردو مولوی عبدالحق
۱۵۰- اطراف رشید احمد صدیقی — اسلوب احمد انصاری
۱۵۱- سورج نکل رہا ہے — ترجمہ: احفاظ الرحمٰن
۱۵۲- مثنویاتِ شوق — رشید حسن خاں
۱۵۳- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری — ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۱۵۴- مشاعرے کا فاتح — ڈاکٹر داؤد رہبر
۱۵۵- اردو کی ادبی تاریخیں — گیان چند جین

مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت حصّہ اوّل =/۱۰۰ روپے، حصّہ دوم =/۱۲۵ روپے، حصّہ سوم =/۱۰۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

شاہ اسماعیل شہیدؒ

تالیف: حسین حسنی

صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۰۵ روپے

ناشر: مکتبۂ قدسیہ، اردو بازار لاہور

شاہ اسماعیل شہید ہماری ملی زندگی کی ایک قد آور شخصیت تھے وہ جتنے قد آور تھے اتنے ہی متنازعہ بھی۔ چنانچہ اپنے مخالفین میں لعن طعن کا سبب رہے ان کے حالات و کارناموں پر تحقیقی اور سیر حاصل کام کی ضرورت رہی مگر اتفاق سے ان پر جس قدر کام ہوئے ان میں سے اکثر ناقص اور غیر معیاری تھے۔

حسین حسنی صاحب کی یہ تالیف شاہ شہید کو اصل تناظر میں سمجھنے سمجھانے کی ایک معیاری کوشش ہے مگر ان کے پیشِ نظر جہاں معیاری و مستند مواد رہا ہے وہیں غیر معتبر حوالہ جات کی بھی کمی نہیں۔

شاہ اسماعیل ایک شعلہ بیان مقرر، ایک بے بدل عالم، ایک زیرک جرنیل اور سب سے بڑھ کر ایک نہایت متقی انسان تھے اور ملت دورِ زوال و زبوں حالی میں ہوش مندی اور صحیح اسلامی فکر کی علامت تھے۔ حسین حسنی صاحب نے معلوم مواد کی روشنی میں شاہ صاحب کی ان حیثیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ کوئی تحقیقی کام نہیں ہے۔ مصنف کا مقصد شاہ صاحب کی سیرت، کردار اور کارناموں کا ایسا خلاصہ پیش کر دینا تھا جس سے آگاہی ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے ضروری ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن ثانوی ماخذ سے استعارے اور طویل و بکثرت اقتباسات سے کام نہ لیتے تو بہتر ہوتا۔ شاہ اسماعیل کی شخصیت اتنی تہہ دار اور ایسی متنازعہ رہی ہے کہ ان کے ہر سوانح نگار کو اس کو پیش کرتے وقت احتیاط، دِقتِ نظر اور مدلل پیش کشی کی ضرورت پڑتی ہے جو خاصا دشوار کام ہے۔

کتاب آسان زبان، عام فہم اسلوب اور جامع بیانات کا حامل ہے اور تاریخ اور سوانح کے طالب علموں کے لیے بڑی مفید ہے۔ ناشر نے اسے بڑے حسن سلیقے اور توجہ سے شائع کیا ہے۔

(ا-ط)

تحریکِ پاکستان اور بلوچستان (توضیحی کتابیات)

تالیف: ڈاکٹر انعام الحق کوثر

صفحات: ۱۱۸، قیمت: ۱۲۰ روپے

ناشر: مکتبہ شال، سٹیلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ

ڈاکٹر انعام الحق کوثر بلوچستان کی زندگی کے ہر گوشے پر کام کرتے رہے ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ انھوں نے بلوچستان سے اپنے تعلق کا حق ادا کر دیا ہے۔ تحریکِ پاکستان اور بلوچستان ایک توضیحی کتابیات ہے جس میں بلوچستان اور بلوچوں پر لکھی جانے والی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں کسی اعتبار سے بلوچستان کا ذکر آیا ہے۔ اس کے لیے بڑی دیدہ ریزی اور تفصیل سے کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے اور قومی تاریخ کی جن کتب میں بلوچستان کا حوالہ آیا ہے ان کے صفحات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے ابواب قائم کر دیے گئے ہیں۔ البتہ محسوس ہوتا ہے کہ اندراجات کو زیادہ سائنٹفک بنایا جا سکتا تھا۔

یہ کتاب بلوچستان کی زندگی کے کسی گوشے پر کام کرنے کے لیے ایک اچھی معاون کتاب ہے۔ جس سے تحقیق کا کوئی طالب عالم بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ کتاب کے آخر میں بلوچستان پر لکھے گئے مقالات و مضامین کی بھی مصنف وار فہرست دے دی گئی ہے۔

(ی-ح)

بلوچستان ـــــ آزادی کے بعد

مصنفین: ڈاکٹر انعام الحق کوثر، پروفیسر انور رومان

صفحات: ۲۶۴، قیمت: ؟؟؟ روپے

ناشر: مشاورہ تعلیمی تحقیق، کوئٹہ

انگریزوں نے اپنے سول ملازمین کے سہولت کے لیے ہر انتظامی اکائی کے لیے گزیٹیر مرتب کرائے تھے جس میں اس علاقے کے جغرافیائی ساخت تاریخی حالات، رسم و رواج، رہن سہن اور دیگر ضروری امور درج ہوتے تھے۔ لیکن یہ گزیٹیر ۱۹۰۵ء تک مرتب کیے گئے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد حکومت انگلشیہ پہلی اور دوسری جنگ عظیموں اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کچھ اس طرح الجھی کہ گزیٹیر مرتب نہ ہو سکے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی حالات ایسے رہے کہ بلوچستان کا کوئی گزیٹیر مرتب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی بلوچستان سے جو وابستگی ہے اور انھوں نے بلوچستان پر جس قدر کام کیا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہ یہ بھاری پتھر بھی اٹھاتے۔ پروفیسر انور رومان کو ساتھ لے کر انھوں نے یہ کام شروع کیا اور بلوچستان کے ہر محکمہ میں جا کر اس کے سربراہوں سے مل کر تفصیلات جمع کیں اور یوں "بلوچستان ـــــ آزادی کے بعد" مرتب کر دی۔

یہ کتاب بلوچستان کی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ اس میں بلوچستان کے جغرافیائی حالات، تاریخ، سیاست، انتظامی امور، اسمبلی، گورنر، انتظامیہ، عدلیہ، تعلیم اور تعلیمی ادارے، صحت، زراعت، صنعت، سماجی بہبود ترقیاتی ادارے غرض کیا ہے جس کا احاطہ نہ کر لیا گیا ہو۔

یہ قاموسی کام ان دو حضرات نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے انجام دیا ہے اور یہ بلوچستان کے بارے میں حوالے کی مستند کتاب بن گئی ہے۔

(ی-ح)

تنقیدی افکار

رؤف انجم

صفحات: ۱۱۸، قیمت: ۱۰۰ روپے

ناشر: اردو اکیڈمی پاکستان، ۷۹۳-این سمن آباد۔

"تنقیدی افکار" میں شامل جناب رؤف انجم کے اکثر مقالے پڑھے۔ ان کی تحریروں کے نظریے اور لب لباب سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ اشیا پر نظر ڈالنے کا ایک خاص پیمانہ اور نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں اور ادب و ادب کی سرگرمیوں کو اس دائرے کا تابع دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے تنقیدی مزاج کی یہ لہریں زیریں رو کے طور پر اکثر مقالے میں دیکھی جاتی ہیں عربی کے عالمی سطح کے اسکالر طٰہٰ حسین نے ادب پر کسی عنوان کی تحدید کو ناروا گردانا ہے۔ ایک طٰہٰ حسین پر کیا موقوف دنیا کے بیشتر عظیم ادیب و دانشور نے اس کلیہ کو تسلیم کیا ہے کہ تحدید کے سائے میں ادب کی خاطر خواہ بڑھوتری ممکن نہیں۔

افلاطون نے اپنی تصنیف "ری پبلک" میں ادب، ادیب و شاعر کے دیس نکالا کی وکالت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ نظریاتی انار کی پھیلاتے ہیں لہٰذا اس مثالی ریاست میں ان کا کوئی مقام نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان کا شاگرد خاص ارسطو بالکل الٹ فکر کا مالک ہے وہ شعر و ادب کو ذہنی بالید گی اور حصولِ مسرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اور شعر و ادب کے کام کو سماجی خدمت قرار دیتا ہے گویا دونوں استاد شاگرد اس معاملے میں دو مختلف سمت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے دیباچے میں جناب رؤف انجم کے مضمون ادب میں "میمنی روئے" کا ذکر کیا ہے۔ یہ رویہ ہر جائز و ناجائز بلکہ بیشتر ناجائز طور پر دولت و مراعات سمیٹنے کا گر سکھاتا ہے۔ ملٹن کی مشہور نظم جنت گم شدہ کے دفتر اول میں ابلیس کے بہت سے ساتھیوں میں ایک کردار Mammon میمن بظاہر شر کا علم بردار نہیں مگر اس کی تمام کارکردگی کی صلاحیتیں شر کے لیے وقف ہیں۔

لُغت میں میمن کے معنی "دولت کا بُت، یا دولت کا شیطان" ایک کاروباری طبقہ میمن سے منسوب چلا آرہا ہے، کہیں اس کاروباری طبقے کے لیے یہ نام انگریزوں کی عملداری میں یہاں وارد تو نہیں ہوا اور کہیں اس کا تعلق ملٹن کے جنتِ گم شدہ (Paradise lost) کے کردار Mammon سے تو نہیں بنتا اس لیے کہ جنت گم شدہ کے میمن کے جو استحصالی خصائص بیان کیے گئے ہیں اس کا آج بھی اس کاروباری طبقہ پر صد فی صد اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ میمنی رویہ مال و زر کے بے جا حصول میں دخیل ہو یا ادب کے توسط سے بے جا فائدہ اٹھانے کے ضمن میں بات ایک ہی ہے۔

رؤف انجم کے فکر کا بنیادی نکتہ دردمندی ہے، دردمندی اس بات کی کہ تقلیدِ مغرب کی رَو میں، مشرقی خصوصیات فراموش نہ ہو جائیں، بے شک ملٹن ہیڈگر، کر کے گار، قابلِ ذکر ہیں لیکن ابن رشد، رومی، بیدل اور غالب بھی قابلِ لحاظ ہیں بلکہ تمام اکابر فلاسفہ، ابن الہیثم، خیام، جابر بن حیان، الخوارزمی، رازی، بو علی سینا، یہ وہ ستون ہیں جنھوں نے فلسفہ و حکمت اور ادب کے میدان میں برسہا برس اپنی برتری قائم رکھی اور یورپینوں کے لیے قابلِ تقلید رہے بہر حال رؤف انجم صاحب کا یہ دکھ جنوں ہے۔ ان کی تنقیدی کتاب "تنقیدی افکار" قابل مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

صد چراغ

قمر ساحری

صفحات: ۶۴، قیمت: ۱۲۵ روپے

ناشر: شان اکیڈمی کراچی، پاکستان، بی-۸ سلیمان، پلازہ، گلشنِ اقبال نمبر ۱۰- کراچی ۷۴

قمر ساحری نے "فکر انگیز" فقرہ نگاری کے لیے ایک لفظ وضع کیا ہے، "فاف"، "جو فکر انگیز" فقرے، کے حروف اوّل کا مجموعہ ہے۔ اور اسے "فاف" نگاری کا نام دے کر ایک کتاب "صد چراغ" کے نام سے مرتب کر ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ جناب قمر نے ایک دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ اور "فاف" کا ڈانڈا ان دیواری تحریروں سے ملایا ہے جو قدیم زمانے میں دنیا کے مختلف ممالک میں رائج اور پند و نصائح کے کام آتے تھے۔ انھوں نے اس کی مطابقت انشائے لطیف میں بھی دیکھی ہے جو اب سے ساٹھ ستر برس پہلے خلیل جبران اور ٹیگور کے اثرات کے تحت اردو میں خاصے رائج اور مقبول تھے۔

چند سال اُدھر ڈاکٹر منیر الدین نے اردو سے جرمنی کی ایک مقبول صنف "افورزم" (Aphorism) کو متعارف کرایا۔ اور اردو تراجم کے ذریعے اس کے نمونے پیش کیے اور افورزم پر مضمون بھی لکھا۔ اور افورزم کے لیے متبادل عنوان فوری طور پر اقوال زرّیں چن لیے گئے۔ "فاف" بھی اسی قسم کی سعی ہے۔

قمر ساحری ہائیکو، ماہیے، آزاد غزل اور آزاد قطعے کا تجربہ کر چکے ہیں اور اکثر تجربات کتابی شکل میں منظرِ عام پر موجود ہیں۔ ان کے یہ "فاف" (فکر انگیز فقرے) ورق میری ڈائری کے عنوان سے اردو کے اکثر رسالے میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اب یہ بھی دبلی پتلی کتاب "صد چراغ" کی صورت میں آپ کے سامنے ہیے۔

قمر ساحری ایک طرح سے گوشہ نشیں ہیں، لیکن خاموش نہیں۔ ان کا ذہن رواں ہے اور وہ کچھ نہ کچھ نیا سوچتے رہتے ہیں۔ اب دیکھیے آگے شعر و ادب کو کیا دیتے ہیں۔

ان کے "فاف" کے چند نمونے درج ہیں۔

کبھی کبھی سچ کہہ لیا کرو تاکہ تم میں جھوٹ بولنے کی طاقت برقرار رہے

ہماری تاریخ ـــــ ہمارے بہادر اور دانش مند بزرگوں کی "سیاسی ضرورتوں" کا مجموعہ ہے۔ انسانوں کی خدمت کا نہیں

شاعروں کو لکھنے دو، ورنہ سورج کل دیر سے نکلے گا

روٹی وہ سورج ہے جسے کھانے کے بعد ذہن سے کرنیں پھوٹتی ہیں

نہیں، تم خوبصورت نہیں ہو، تمھاری عمر خوبصورت ہے

شاعری کھلی آنکھوں کا سفر نامہ ہے۔ بند آنکھوں کا فالنامہ نہیں

اقبال کا شعری فکری منظر نامہ

پروفیسر شاہدہ یوسف

صفحات: ۲۳۸، قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: نظریہ پاکستان اکادمی ۳۱۳-ایچ ۲/۱ جوہر ٹاؤن، لاہور

علامہ اقبال، پروفیسر شاہدہ یوسف کا من پسند موضوع ہیں، قومی زبان یا دوسرے جریدوں میں اب تک اقبال پر اُن کے جتنے مضامین نظر سے گزرے ہیں، وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کا بڑی دلی جمعی سے مطالعہ کیا ہے اُن کے فلسفیانہ افکار اور رموز و نکات جن اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی ہے، اور علامہ کی بصیرت کے کک شب تاب کو فکر و خیال کی مٹھیوں میں چند لمحے رکھ کر اس کی نرم حرارت اور روشنی کو حرز جان بنایا ہے اور سب سے بڑھ کر اقبال گی خصوصیات کے Discourse کے لیے ایک خاص زبان وضع کرتی ہے جو نثر میں اقبال کے الفاظ کا آہنگ رکھتی ہے، اس کا اپنا ایک پُروقار لہجہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونچے مقام سے بات کی جارہی ہے۔ یہ خصوصیت زبان و اسلوب دیگر اقبال شناسوں کے ہاں کم کم دیکھی جاتی ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے پیش محترمہ شاہدہ کی تحریر کی اقبال شناسی کچھ اسی انداز میں آئی ہے۔

""اقبال کا شعری، فکری منظر نامہ" اقبال کے اندھا دھند انباروں میں ایک اور کتاب کے اضافے کی بجائے اقبال کی تفہیم کا ایک منفرد شہپارہ ہے۔"

ایک اور اقبال شناس ڈاکٹر وحید عشرت نے کتاب مذکور کے دیباچے پر پروفیسر شاہدہ کی اقبال فہمی کو اِن الفاظ میں سراہا ہے:

"وہ ماہرین اقبالیات کی صف میں شمار کی جاسکتی ہیں۔"

خود اپنی کتاب زیر بحث کے پیش لفظ میں پروفیسر شاہدہ یوسف لکھتی ہیں:

"علامہ اقبال کے فکر و فن کے اس تحیّر کدے کی زیارت میں نے اپنے والد پیر محمد رفیع الدین شاہ علیگ کی رہنمائی میں کی ہے میرے دل میں علامہ اقبال کے لیے بے پایاں محبت ان کے دیے ہوئے ورثوں میں سے ایک انتہائی قیمتی ورثہ ہے۔"

اور پروفیسر شاہدہ نے اس میراث کی نہ صرف سنبھال کے دل و دماغ میں پرورش کی، بلکہ اسے کاغذ پر منتقل کر کے اقبال شناسی کا حق ادا کیا۔ اور اپنے والد کی صحیح وارث ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

کتاب مذکور میں شامل کچھ موضوعات ایسے ہیں جن میں نئے زاویے سے علامہ پر بات کرنے کی گنجائش نکلی ہے۔ یہ اس بات کی گواہی ہے کہ پروفیسر شاہدہ یوسف علامہ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے تکرار سے بچنا چاہتی ہیں۔

کتاب اچھی چھپی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

(ا۔ س)

سوکھی پتیاں

افسر ماہ پوری
صفحات: ۱۸۰، قیمت: ۱۵۰ روپے
ناشر: ایل ۷۲۹ سیکٹر ۵ سی، ٹو بلال ٹاؤن، شمالی کراچی۔

افسر ماہ پوری کے ذکر کے ساتھ اُن کے بہت ہی قریبی رفیق یونس احمر یاد آجاتے ہیں میں نے اُنھیں کلکتہ میں ۱۹۴۳ء اور بعد ازاں ۱۹۴۶ء میں ایک ساتھ لکھتے پڑھتے دیکھا تھا۔ دونوں کی یاری لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور تب سے کراچی میں دوسری ہجرت کے نتیجے میں آنے کے بعد، افسر صاحب کے انتقال تک یہ جوڑی بنی رہی۔ میں اس کا گواہ ہوں کہ دونوں نے اس رفاقت پر فخر کیا۔ ایسے دوست بھی کم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

افسر صاحب صراطِ مستقیم کے آدمی تھے وہ ہمیشہ ایک وضع قطع میں دیکھے گئے۔ خلتا پائجامہ اور کرتے میں ملبوس! یہ لباس ان کی تخصیص بن گیا تھا۔ لفظ "خوبصورت" افسر صاحب کے مزاج پر بڑا چسپاں ہوتا ہے۔ ان کی شریف النفسی اور قلندرانہ اطوار کے متعلق ان کے تمام احباب ایک ہی رائے رکھتے تھے۔

ان کا افسانوی مجموعہ "سوکھی پتیاں" ان کے صاحبزادے ڈاکٹر حامد نے شائع کیا ہے۔ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے کئی شعری مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

افسر صاحب نے ابتدا افسانہ نگاری سے کی، قیامِ پاکستان کے بعد جب ڈھاکے آئے تو ۱۹۴۸ء میں شاعری کی جانب راجع ہو گئے افسانہ نگاری گاہے گاہے کا مشغلہ رہ گیا۔ پھر بھی اس افسانوی مجموعے میں جتنے افسانے شامل ہیں وہ درمیانے طبقے کی معاشرت کے گہرے مطالعے کا پتا دیتے ہیں۔ اس طبقے کے دکھ درد اور مسائل بہت بے ساختہ اجاگر ہوئے ہیں۔

افسر صاحب کے افسانوں پر زیادہ بات اس لیے نہیں کروں گا کہ ڈاکٹر فہیم اعظمی اور محمود واجد صاحب نے ان کے افسانوں پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ اُنھیں یہ حق پہنچتا ہے کیونکہ دونوں اچھے افسانہ نگار اور فکشن کے نقاد ہیں۔

افسر صاحب، صاحبِ علم تھے، ذولسان، بلکہ سہ لسان تھے۔ اردو، انگریزی اور بنگلہ پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے لیے میں نے انھیں مہینوں (Talk) لکھتے نہیں بلکہ ٹائپ کرتے دیکھا ہے۔ اُنھوں نے نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان کے بنگلہ افسانے کے ترجمے پرانے نیرنگِ خیال میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

افسر صاحب نے اپنے افسانے "دیوار" میں ایک انگریزی مقولہ نقل کیا ہے:

I slept, dreamt, the life is beauty
I woke and found that life is duty.

افسر صاحب زندگی بھر اسی قول کی روح پر کاربند رہے اور ایک کامیاب زندگی گزاری پھر وہ کیونکر کامیاب شاعر اور افسانہ نگار نہ ہوتے۔

"سوکھی پتیاں" کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جمیل عظیم آبادی کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں۔

(ا۔ س)

گردوپیش

اسلامی جمعیت طلبہ کی جانب سے ہفتہ کتب کا انعقاد

گزشتہ دنوں اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی میں ایک سہ روزہ (۵، ۶، ۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء) کتب میلے کا انعقاد ہوا۔ اس میلے میں دوسرے کتب پبلشروں اور کتب فروشوں کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان نے بھی اپنا بک اسٹال لگایا۔ اس ہفتۂ کتب کے دوسرے دن کے افتتاح کے موقع پر معتمد انجمن ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے کہا کہ کتب میلے اور دیگر تعلیمی سرگرمیوں کو بحال رکھنا ازبس ضروری ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ یہ کتب میلہ کراچی میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ثابت ہوگا۔ اور اس سے لوگوں میں علمی شعور کے پروان چڑھنے کا راستہ ہموار ہوگا۔

اس موقع پر امریکی قونصل جنرل، اردو سائنس کالج اور سیفی کالج کے پرنسپل حضرات نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ جس میں کتب میلے کی اہمیت اور اس کے دوررس اثرات کی نشاندہی کی گئی تھی۔

آرٹس کونسل آف پاکستان کی ادبی کمیٹی کی طرف سے ایک مذاکرہ

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی ادبی کمیٹی کی جانب سے ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا جس میں پاکستانی قومی ادب بہ حوالہ قومی زبان اردو کا جائزہ لیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی ڈاکٹر جمیل الدین نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض جناب اقبال حیدر نے انجام دیے۔ تلاوتِ کلام پاک اور محترمہ ذکیہ غزل کی نعت خوانی کے بعد مذاکرے کا آغاز ڈاکٹر یونس حسنی کے مقالے "شعری ادب" سے ہوا۔ جو منظوم ادب کا احاطہ کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ ان کی غیر حاضری کی وجہ سے جناب راشد نور نے پڑھ کر سنایا۔ مقالے میں کہا گیا تھا کہ مغلیہ دورِ حکومت کے زوال کے ساتھ اردو نظم کا عروج ہوا۔ جس میں دور بہ دور نمایاں ناموں: مولانا حالی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور مولانا حسرت موہانی اور دیگر شعرا بھی شامل ہیں، ان سب نے تحریکِ پاکستان میں اپنی شاعری کے ذریعے بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔

پروفیسر سحر انصاری اپنے مضمون اردو نثر کی شروعات کا رشتہ سرسید کی تصنیف "اسبابِ بغاوتِ ہند" سے جوڑا۔ اس تسلسل میں بات جب پاکستانی ادب تک آئی تو انھوں نے شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" اور انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" کا ذکر کیا اور کہا کہ ان ناولوں میں قومیت کا تصور پایا جاتا ہے۔

ان نظمی و نثری تجزیوں کے بعد معروف صحافی غازی صلاح الدین کو دعوتِ گفتگو دی گئی انھوں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا کہ میری گفتگو دراصل سوالات پر مبنی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادب کا وظیفہ امن کی بات کرنا ہے کیونکہ ارتقا کا شاخ در شاخ مفہوم اسی ایک کلیدی لفظ سے وابستہ ہے۔

جناب امراؤ طارق نے کہا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو جمہوری انداز میں وجود میں آیا ہے۔ اس کی عمر صرف ۵۲ سال ہے اور کسی نئی سرزمین کی تاریخ میں یہ عمر بہت زیادہ نہیں سمجھی جاسکتی رہا پاکستان کا اس کے چاہنے والوں کے نعروں میں زندہ اور پائندہ رہنا سو یہ آواز قوم اور قومیت کے تصور کو زیادہ گہری اور شدید کرتی ہے اور یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ پاکستان کی تحریک میں زبان کے محاذ پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ناقابلِ فراموش خدمات بھی قابلِ تکریم ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے قومیت کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے اردو شاعری اور اردو نثر کے حوالے سے مدلل اور عالمانہ جواب دیے اور سامعین کی جانب سے اٹھائے جانے والے سوالات کا مرکز بنے رہے۔

گفتگو میں جناب محسن بھوپالی نے بھی حصہ لیا اور اپنے ان شعروں کا حوالہ دیا جن میں پاکستان قومیت کا تصور اُجاگر ہوتا ہے۔

آخر میں صدر ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے گفتگو کے دوران اُٹھائے جانے والے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پاکستانی قومیت کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں شاعروں کا بہت بڑا حصہ ہے خاص طور سے یہ جذبہ بحران کے اوقات میں بڑا واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جس کی ایک مثال ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے جب رئیس امروہوی کراچی میں بیٹھ کر "خطۂ لاہور تیرے جانثاروں کو سلام" جیسا نغمہ تخلیق کرتے ہیں۔ اس کارِ خیر میں تھوڑا بہت حصہ اس عاجز کا اور دوسرے پاکستانی شعرا کا بھی ہے۔

انھوں نے کہا کہ جنگ کے بارے میں یہ کہنا کہ جنگ کا سبب جائز ہوتا ہے یا نہیں یہ فیصلہ وقت گزرنے پر تاریخ دیا کرتی ہے لیکن وہ سپاہی جو اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوتے ہیں ان کے لیے "اے وطن کے سجیلے جوانو" پوری قوم کا نغمہ بن جاتا ہے۔

مذاکرے کے آغاز میں خیر مقدمی کلمات محترمہ قدسیہ اکبر نے اور اختتامی کلمات حرفِ تشکر کے طور پر جناب اظہر عباس ہاشمی نے کہے اور جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور فاطمہ حسن کے ساتھ ایک شام مشترک

گزشتہ دنوں اولڈ راوین ایسوسی ایشن کراچی کے زیرِ اہتمام مشہور ماہرِ تعلیم دانشور، پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی صدارت میں ہوٹل آواری میں ایک شام مشترکہ طور پر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور معروف شاعرہ فاطمہ حسن کے ساتھ منعقد کی گئی اس پروگرام کی نظامت مشہور صحافی اور کالم نویس جناب سجاد میر نے انجام دی جبکہ ابتدائی کلمات اور اظہار تشکر ادارے کے خازن جناب محمد احمد خاں یوسفی نے ادا کیے۔ سجاد میر نے اپنے اعزازی "راوینز" ہونے کا فخریہ ذکر کیا انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور پورے برِصغیر پاک و ہند کے تناظر میں مولانا محمد حسین آزاد کی آمد کے بعد سے اردو کے لیے کالج کی خدمات اور اس مرکز سے وابستہ اکابر کا تذکرہ کیا۔ جن میں اقبال، پطرس، فیض، راشد، تصدق حسین خالد، صوفی تبسم، قیوم نظر، ضیا جالندھری، صفدر میر، تبسم کاشمیری، اور افتخار جالب کے نامِ نامی شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے برِصغیر پاک و ہند کی آزادی کے سلسلے میں جو کردار ادا کیے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے فرمایا آج طفیل بہت یاد آئے۔ یہاں محمود شام کمال کے آدمی ہیں ان پر جرمانہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر دس اداریوں کے بعد ایسا ہی ایک مضمون لکھا کریں۔ اولڈ راوینز کا خیال کر کے تو لگتا ہے کہ:

ہم اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

فاطمہ حسن کے پسندیدہ اشعار کا ذکر کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ وہ اشعار جو مجھے پسند تھے اوروں نے مجھ سے پہلے ہی سنا دیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فاطمہ کے ہاں آج کی عورت بہت حقیقت پسند ہے۔ اس کے جذبات مردوں سے جداگانہ نہیں ہوتے۔ فاطمہ کے ہاں سفر کا استعارہ ہے وہ کبھی تھک کے نہیں بیٹھی۔ زمین کے بھی استعارے کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ وہ بہت کچھ مانگنا چاہتی ہے مگر کم مانگ پائی ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے ذکر پر ڈاکٹر کنفی نے فرمایا کہ ان کے بارے میں مشکل ہے کہ میں معروضی طور پر بات کر سکوں میں نے ان کے تعلیمی دور ہی میں ایک بڑا شاعر بننے کی پیش گوئی کی تھی ان کی بڑی ردیفوں پر تحقیق ہونی چاہیے کیونکہ اس میں مطالعے کی جانشنی کا ایک جدا رنگ ہے۔ ان کا لہجہ ریشمی نہیں خاکستری ہے جو تیز شعلوں کی تپش بھی رکھتا ہے۔

ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی جناب محمود شام نے اپنے مضمون میں کہا کہ یہ "مہمانِ اعزازی" کی بدعت بھی عجیب ہے بغیر معاوضہ۔ کیسا بُرا وقت ہے جو اپنے ہی "ہم کالموں" کے ہاتھوں پڑا ہے۔ یہ یوسفی صاحب کبھی میگزین "راوی" کے مدیر تھے جب اس کالج کا معیارِ تعلیم بہت اچھا تھا۔ جہاں سے زیادہ تر بیوروکریٹس، شاعر اور محقق برامد ہوتے تھے اب معیارِ تعلیم گرنے سے ورزا برآمد ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا اولڈ راوینز نے کراچی سے رشتہ استوار کرنے کے لیے ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور فاطمہ حسن کو چنا ہے۔ میں نے ڈیڑھ سال پہلے پیرزادہ صاحب سے کسی شادی لان میں کہا تھا کہ فاطمہ حسن کے بارے میں منیر نیازی کہتے ہیں کہ اس کے دل میں کچھ ہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ میں ڈیڑھ سال پہلے جو بات تھی آج بھی وہی ہے یہ پیشے کا جبر تھا کہ میرا زیادہ تر وقت دوسرے قسم کے پیرزادوں کے ساتھ گزرا یہ صاحب تو اس طور کی شخصیت نہیں لگتے اپنے کام سے کام کسی کی لاگ لپٹ میں نہیں ان کی شخصیت کا عجب سحر ہے کہ انھیں کوئی بُرا نہیں کہتا۔

جناب پروفیسر سحر انصاری نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں پیرزادہ صاحب سے اتنا زیادہ قریب رہا ہوں کہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی وہ شخص شاعر نہیں ہو سکتا جو خود پر تنقید نہیں کر سکتا ہو۔ پنجاب کی مجلسوں سے شاعری کا جو چراغ روشن ہوا اس کا اجالا بہت دور تک پھیلا ہے۔ جدت کیا ہے ایک چھپکلی کی کٹی دم ہے جو یقیناً کچھ دیر زندہ رہتی ہے، جیسے یونان اور سسلی کے اندازہائے فکر! پیرزادہ صاحب کی شاعری میں روشنی، مٹی، ہوا اور دیا کے استعارے بالالتزام آتے ہیں۔ تیس سے زیادہ اخبار اور رسالے ان پر مضامین لکھ چکے ہیں۔ ۱۷۰ سے زیادہ اشخاص رائے زنی کر چکے ہیں۔ کراچی کے حالات اور زندگی کا ذکر بھی ان کے یہاں موجود ہے۔

راولپنڈی سے آئے ہوئے صحافی اور معروف کالم نویس جناب اظہار الحق نے اپنے مضمون "محبت سے ہجرت" کے عنوان کے تحت کہا کہ میں شاعری کا محض ایک قاری ہوں جہاں چاہتا ہوں حظ اٹھاتا ہوں اور ضروری سمجھتا ہوں تو تنقید کرتا ہوں۔ فاطمہ حسن کے مجموعہ کلام "دستک سے در کا فاصلہ" آہستگی سے ارتقا کا سفر ہے۔ اس کی شاعری کے عناصر ترکیبی میں تین بادبان ہیں، محبت، ہجرت، اور وطن کی زبوں حالی، اس کی نظمیں مہذب لہجہ رکھتی ہیں، محبت کی شدت ہے۔ اس کی شاعری میں دم خم ہے۔ وہ سامنا کر سکتی ہے۔

راویتی مضمون غزل کو مجروح نہیں کرتا فاطمہ کی پوٹلی میں دو ہجرتیں ہیں اس نے "شہرِ آشوب" نہیں لکھا مگر "زخم" لکھا۔

(عرفان علی عابدی)

ارتقا ادبی فورم میں "تجزیہ" پر گفتگو

پچھلے دنوں ارتقا ادبی فورم کے زیرِ اہتمام معمول کی ماہانہ نشست میں محترمہ پروین افشاں راؤ کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "تجزیہ" پر گفتگو ہوئی جس کی صدارت جناب حسن عابدی نے فرمائی۔ نظامت کا فریضہ ادبی فورم کے سیکرٹری جناب جمال نقوی نے ادا کیا۔ اُنھوں نے محترمہ پروین افشاں راؤ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ لاہور سے تشریف لائی ہیں تنقید ان کا خاص موضوع ہے وہ اپنی ایک رائے رکھتی ہیں۔

جناب رؤف نیازی نے کتاب مذکور پر ایک تجزیاتی مضمون پیش کیا انھوں نے اپنے مضمون میں انگریزی ادب کے شہرۂ آفاق ناول نویس جین آسٹن پر محترمہ راؤ کے لکھے گئے مضمون کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ محترمہ راؤ کے یہاں اپنی رائے پر اصرار کا اظہار ملتا ہے۔ تنقید کی دنیا میں ان کی آمد خوش آئند ہے۔

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے مختصر مگر جامع مضمون پیش کیا اور بتایا کہ محترمہ راؤ نے غیر ملکی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ انھیں مختلف مضامین کی صورت میں اپنی کتاب "تجزیہ" میں پیش کر دیے ہیں۔ وہ ممتاز شیریں کی قائم مقام کہی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر شبنم صدیقی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب بہت اہم ہے اور اسے اردو تنقید میں ایک اضافہ کہا جاسکتا ہے اس میں کلاسیک کو موضوع بنایا گیا ہے جناب شبنم نے بعض مضامین میں اُن کے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کیا ان کا خیال ہے کہ محترمہ نے اپنی کتاب میں دوستووسکی کی جس قنوطیت کا اظہار کیا ہے وہ درست نہیں انھیں چاہیے تھا کہ اس شہرۂ آفاق مصنف کے مثبت رجحانات سے بھی بحث کرتیں جبکہ "ری ریڈنگ آف دوستووسکی" نامی کتاب میں ساری باتیں بتا دی گئی ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مصنفہ کہا کہ مجھے تو وہی دکھائی دیتا ہے جو میں نے پڑھا ہے۔ مجھے تو اس میں قنوطیت ہی نظر آئی۔ باقی چیزیں میں نے نہیں پڑھیں۔ جناب شفیق احمد شفیق نے کہا کہ نقاد کا کام ہے کہ وہ تمام متعلقہ چیزوں کو پڑھے اور پھر اس کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرے۔ جناب اسرار ساکی نے کہا کہ انھوں نے ادب کے موضوعات کو شرکتِ خیال کے طور پر لیا ہے۔ ان کے مضمون کا عنوان "تنقید اور تخلیقی شرکتِ خیال" ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ ان مضامین کا تنقیدی تصور معروضی قدر لیے ہوئے ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے ادبی موضوعات کو نہایت سنجیدگی سے پڑھا ہے۔

صدر گرامی جناب حسن عابدی نے کہا کہ محترمہ پروین افشاں راؤ کی کتاب پر جو مضامین پڑھے گئے ان سے تنقید کا معیار قائم ہوا ہے ان سے قاری اور ناقد نا مطمئن نہیں۔ موجودہ دور میں تنقید کا رجحان کمزور ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں جو مسائل چھیڑے گئے ہیں اور معاشرے کو جس انداز میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ پروین کا یہ مجموعہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

آج کی نشست کا دوسرا دور شاعری کے لیے مختص تھا۔ جس میں معروف شاعرہ محترمہ شہناز نور نے کئی خوبصورت غزلیں سنائیں۔

احمد زین الدین

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پندرہ روزہ نشست

گزشتہ دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کی پندرہ روزہ ادبی نشست پی ایم اے ہاؤس میں منعقد ہوئی جس کی صدارت معروف شاعر جناب نکہت بریلوی نے کی جبکہ نظامت کا فریضہ جناب حسن عابدی نے ادا کیا۔ پروگرام کے بموجب جناب ظہیر اختر بیدری

نے تنقید کے لیے اپنا افسانہ "برف کے شہید" اور جناب صبا اکرام نے اپنی نظم "انتظار کا موسم" پیش کی۔ افسانے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب رؤف نیازی نے کہا کہ اس افسانے میں زمین سے محبت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ زمین کی خاطر جنگیں ہوئی ہیں۔ مگر اس میں جو تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے اس سے زمین کی محبت کی نفی ہوتی ہے۔ جناب مسلم شمیم نے کہا کہ یہ ایک "انٹی وار" افسانہ ہے جو امن کے حق میں ہے۔ جناب نعیم آروی نے کہا کہ اس کہانی کی خرابی یہ ہے کہ اس میں جارح حب الوطنی ہے۔ اور اس کا اختتام بھی اس پر ہوا ہے۔ جناب ساجد مدہوش نے کہا کہ امن اچھی چیز ہے مگر بسا اوقات جنگ لڑنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ جناب شفیع ادبی نے کہا کہ افسانے میں تین باتیں ہیں۔ بیت، مقصد اور آغاز، اختتام میں ایک دوسرے کو گولی مار کر ختم کر لینا، بڑا عجلت پسندانہ اختتام ہے۔ دونوں بچ جاتے تو پتہ چلتا کہ زندگی زیادہ اہم ہے۔ اچھی کوشش ہے مگر اختتام پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

جناب صبا اکرام نے کہا کہ اس کہانی کو اثر پذیری کے عمل سے گزرنا چاہیے تھا۔ گفتگو میں جناب عرفان علی عابدی اور جناب وقار فاروق نے بھی حصہ لیا۔

جناب صدر نے اپنے خطاب میں کہا کہ امن کے موضوع پر یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ افسانہ ریسرچ ورک نہیں ہوتا۔ اس کا ٹریٹمنٹ کمزور ہے۔ اس میں دونوں کی نفرت کا سلسلہ برقرار رہتا ہے اس لیے مارتے ہیں۔ مجھے تو یہ افسانہ اچھا لگا۔

صبا اکرام کی نظم پر گفتگو کرتے ہوئے جناب مسلم شمیم نے اس کے ہر پہلو کی وضاحت کی اور کہا کہ یہ علامتی نظم ہے مگر ابہام سے پاک ہے اس میں معاشرے سے اخذ کیا ہوا تاثر ہے جسے زندگی کی محرومیوں کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ جناب رزاق مسکش نے کہا کہ یہ ایک عمدہ نظم ہے جس میں غربت کے حوالے سے پورے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ جناب جمال نقوی نے کہا کہ اس میں روشن خیالی کی ہمہ گیریت ہے اور نئی صبح کی نوید ملتی ہے۔ جناب رؤف نیازی نے کہا کہ اس نظم کا بھرپور تاثر ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال برمحل ہے۔ وارث رضا نے ایک سوال اٹھایا کہ یہ نظم ابلاغ کرتی ہے یا نہیں؟ اس پر بات ہونی چاہیے۔ رؤف نیازی نے جواب دیتے ہوئے کہا اس میں تشکیلات لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ استعارے نہیں ہیں۔

صدر گرامی جناب نکہت بریلوی نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ صبا اکرام صاحب بہت اچھے شاعر ہیں جدیدیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں شعری جمالیات سے بھی کام لیا گیا ہے اور مکمل تاثر موجود ہے یہ بہت عمدہ نظم ہے۔

(رپورٹ: احمد زین الدین)

ذکر ایک محفل کا

گزشتہ دنوں حیدر آباد جرنلسٹ لٹریری فورم کے اہتمام ایوانِ صحافت حیدر آباد میں ملک کے ممتاز ماہرِ تعلیم افسانہ نگار پروفیسر خالد وہاب کی صدارت میں شامِ افسانہ کا انعقاد کیا گیا۔ جبکہ ڈاکٹر شمیم انصاری مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئیں نظامت کے فرائض آفتاب علیم قریشی نے انجام دیے اور ابتدا میں اپنا افسانہ "مٹی کے گھروندے" پیش کیا اسی طرح ایاز مراد چنا نے "سہیلی کے آنسو"، شاکر جمال نے "جھومر"، شاہین تبسم نے "سوچ کے دھارے"، مسرور احمد زئی نے "بادِ سموم"، اسلم شہزاد نے "آزاد کشمیر ہوٹل"، روبینہ راجپوت نے "پہلا سانس"، ملک غلام مصطفیٰ تبسم نے "بلاعنوان" حیدر آباد کے معروف افسانہ نگار قدیر غوثی نے "آوازیں رہ جاتی ہیں" اور تقریب کی مہمانِ خاص محترمہ ڈاکٹر شمیم انصاری نے افسانے "اپنا گھر" پیش کیا۔

حاجی عدیل نے مختصر خطاب میں اسے ایک اچھی روایت قرار دی اور کہا کہ دہشت زدہ ماحول میں شامِ افسانہ نیک شگون ہے اور

میں حیدر آباد جرنلسٹ لٹریری فورم کو اس کامیاب تقریب منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

صدر محفل پروفیسر خالد وہاب صاحب نے شہر حیدر آباد میں شامِ افسانہ کی ابتدا اور ارتقاء کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ابتدا انجمن کے تحت کوکب جمیل اور اس ناچیز کی کاوشوں سے ہوئی اس میں مرحوم سید کاظم رضا اور قدیر غوثی نے اپنے افسانے پیش کیے تھے اور محترم قاصد عزیز صاحب بھی اس تقریب میں موجود تھے اسی دوران محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا اس میں فیض احمد فیض مرحوم اور احمد ندیم قاسمی بطورِ خاص تشریف لائے تھے اور انھی دنوں میں "ادب اور قومی مسائل" کے عنوان سے پریس کلب حیدر آباد میں ایک مذاکرہ بھی ہوا تھا اُس وقت احمد ندیم قاسمی نے قدیر غوثی کے افسانے کو سراہا تھا۔ اس کے بعد حیدر آباد کے سیاسی معاشی اور اقتصادی حالات بد تر ہوگئے اور ان محافل کا انعقاد ممکن نہ رہا مگر اب دیکھا جارہا ہے کہ نئی نسل میں ادب سے دل چسپی پیدا ہورہی ہے جو کہ خوش آئند ہے۔ انھوں نے اس محفل میں پڑھے گئے افسانوں پر صدارتی رائے دیتے ہوئے کہا کہ قارئین کو افسانے سے دل چسپی اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ افسانہ نگار عصر حاضر کے مسائل و مصائب کو موضوع بنائے آج جو افسانے پڑھے گئے ہیں ان میں ایسے ہی واقعات کو پیش کیا گیا ہے جس کا آج ہم سب کو سامنا ہے۔ اُنھوں نے جستہ جستہ افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مسرور احمد زئی کے افسانے اس سے قبل بھی مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں بالخصوص "بساط" گزشتہ دنوں میری نظر سے گزرا اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ آج جو افسانہ اُنھوں نے پڑھا وہ ایک اہم انسانیت سوز موضوع یعنی کارو کاری پر تھا جو پلاٹ اور تکنیک کے اعتبار سے ایک کامیاب افسانہ تھا، آفتاب عالم ۔ اپنے افسانے میں زندگی کے نازک اور لطیف احساسات کو اُجاگر کیا ہے اُنھوں نے کہا کہ قدیر غوثی کا افسانہ ان کے مزاج اور اسلوب سے قدرے مختلف افسانہ تھا اس میں طنز و مزاح کا عنصر شامل ہے جس میں معنویت پوشیدہ ہے، اُنھوں نے محترمہ ڈاکٹر شمیم انصاری کے "اپنا گھر" کے بارے میں کہا کہ اس افسانے کا کوئی جملہ غیر ضروری نہیں تھا افسانے کا موضوع قابل تعریف ہے اُنھوں نے غلام عباس کا شہرۂ آفاق افسانہ "کتبہ" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ گو غلام عباس اس موضوع پر قلم اُٹھا چکے ہیں مگر Treatment کے اعتبار سے یہ بالکل مختلف افسانہ ہے یہ افسانہ ناامیدی میں امید کی کرن پیدا کرتا ہے یہ ایک اثر انگیز اور معیاری افسانہ تھا۔ آخر میں صدر محفل نے حیدر آباد جرنلسٹ لٹریری فورم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کامیاب "شام افسانہ" برپا کرنے پر انھیں مبارک باد پیش کی۔

علاوہ ازیں قاصد عزیز، ناہید رعنا ناہید، شکیل احمد خاں، غلام حسین صمدانی، حمید الدین ایڈوکیٹ، طلعت صابر علی، وسیم خان، اکرام جعفری، عزیز وارثی نے شرکت کی۔

(رپورٹ: پروفیسر خالد وہاب)

ڈاکٹر اختر حمید خاں انتقال کر گئے

محترم اور عالمی شہرت کے سوشل سائنسداں ڈاکٹر حمید اختر خاں کا انتقال ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو امریکہ میں ہوا۔ وہاں وہ مئی ۱۹۹۹ء کے مہینے میں خویش و اقارب سے ذاتی ملاقات کے لیے گئے ہوئے تھے۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۸۵ سال تھی۔ انتقال کے بعد اُن کی میت کراچی لائی گئی اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اُن کی تجہیز و تدفین "اورنگی پائلٹ پروجیکٹ" کے احاطے میں ہوئی۔ نماز جنازہ مبارک شہید میدان میں پڑھائی گئی، جس میں ہزاروں عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ ۱۶ اکتوبر ہی کو نیپا آڈیٹوریم میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔

ڈاکٹر اختر حمید خاں کئی اعتبار سے اس صدی کی ایک اہم علمی و ادبی، سیاسی شخصیت تھے اور مزاج شاعرانہ رکھتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے کومیلا (مشرقی بنگال) میں تقرری ہوئی۔

کومیلا دیہات سدھار (Rural Development) کے منصوبہ پر مثالی کارکردگی کے مظاہرہ اور نیابت کی وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک انھیں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی۔ وہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے تھے اور پھر سقوط مشرقی پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ اورنگی کی مضافاتی بستی میں کومیلا دیہات سدھار کے طرز پر اورنگی پائلٹ پراجیکٹ کا آغاز کیا۔ اِس پراجیکٹ کے سلسلے میں بھی انھیں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی اور بالآخر اسی کی خاک میں پیوند ہوئے۔

بھارت کے محقق ڈاکٹر سید حسنین کا اسلام آباد میں انتقال

گزشتہ دنوں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے خویش و اقارب سے ملنے کے لیے ہندوستان سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر حسنین کی تحقیقی تصنیف انشائیہ کے موضوع پر ہے جو پہلی بار پچاس کی دہائی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ گیا میں ایک عرصہ تک کالج میں اُردو پڑھاتے رہے۔ ادب پر اُن کی نظر گہری اور محققانہ تھی، انتقال سے ہفتہ عشرہ پہلے وہ احباب سے ملنے جناب مشفق خواجہ کے ہاں تشریف لائے تھے۔ وہ بائی پاس آپریشن سے گزرنے کے باوجود ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ سچ ہے موت کب، کس وقت اور کہاں آجائے کسی کو خبر نہیں۔ ڈاکٹر حسنین ان دنوں ریٹائرمنٹ کی زندگی علی گڑھ میں گزار رہے تھے۔ وطن سے دور انھیں مٹی پاکستان کھینچ لائی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین

برصغیر کے ممتاز مزاح نگار کرنل محمد خاں انتقال کر گئے

برصغیر کے ممتاز مزاح نگار کرنل محمد خاں ہفتے کی صبح طویل علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے، مرحوم ۱۹۰۹ء میں چکوال کے قصبے بالکسر میں چوہدری امیر خاں کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول چکوال سے حاصل کی، اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۱ء میں بی اے کیا۔ ابتداء میں فیروز سنز کے اخبار "ایسٹرن ٹائمز" میں بطور اسپورٹس رائٹر کام کیا، پنجاب یونی ورسٹی سے اقتصادیات میں ایم اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں شامل ہوگئے، بعدازاں ۱۹۴۵ء میں بطور سیکنڈ لیفٹننٹ پاکستان آرمی جوائن کیا جہاں سے جولائی ۱۹۶۹ء میں فل کرنل کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ ان کی تصانیف "بجنگ آمد"، "بسلامت روی"، "بزم آرائیاں" اور "بدیسی مزاح" ہر عمر کے پڑھنے والوں اور ادبی حلقوں میں آج بھی روزاول کی طرح مقبول ہیں۔ ان کے انتقال سے چند روز قبل ان کے دوست بریگیڈئیر محمد اسمٰعیل صدیقی نے ان کی سوانح عمری کرنل محمد خان مزاح کا "جنرل رومیل" کے نام سے شائع کی ہے۔ مرحوم کو ان کے آبائی گاؤں بالکسر میں سپردِ خاک کیا جائے گا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی، ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

انجمن ترقی اردو کا تعزیتی اجلاس

مشہور طنز و مزاح نگار کرنل (ریٹائرڈ) محمد خاں کے انتقال پر انجمن ترقی اردو پاکستان کا ایک تعزیتی جلسہ نائب معتمد امراؤ طارق انجمن

کی صدارت میں منعقد ہوا۔

تعزیتی اجلاس میں کرنل محمد خاں کی مزاح کی چاشنی لیے ہوئے طنز سے بھرپور تحریروں پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ ان کی پہلی تصنیف "بجنگ آمد" کا خصوصیت سے ذکر ہوا جس نے ان کو صفِ اوّل کا طنز نگار ثابت کیا۔ "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" بھی ان کی شوخیِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

کرنل محمد خاں کی رحلت سے طنز و مزاح کی صنف کو جو دھچکا پہنچا ہے اس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ شرکا نے مرحوم کی مغفرت اور ان کے لواحقین کے صبر جمیل کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر اعزازی جناب آفتاب احمد خاں اور معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے بھی کرنل محمد خاں کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس کو ادب کے لیے گراں قدر نقصان قرار دیا ہے۔

پروفیسر کرار حسین کے انتقال پر انجمن ترقی اردو کا اجلاس

کراچی (پ ر) ممتاز دانش ور، ادیب اسکالر اور ماہرِ تعلیمات پروفیسر کرار حسین کے انتقال پر انجمن ترقی اردو پاکستان کا ایک تعزیتی اجلاس نائب معتمد امراؤطارق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں پروفیسر کرار حسین کی ادبی، علمی اور تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی ولولہ انگیز شخصیت اور اعلیٰ خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اجلاس میں مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔ شرکائے اجلاس نے ان کی بیوہ اور صاحبزادے تاج حیدر اور دیگر متعلقین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے صبر جمیل کے لیے بھی دعا کی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر اعزازی جناب آفتاب احمد خاں اور معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے بھی پروفیسر کرار حسین کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو علم و ادب کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

(رپورٹ: شہاب الدین قدوائی)

ازراہ کرم مضمون نگار حضرات مضامین کی پشت پر اپنا مکمل پتا دینا نہ بھولیں۔

گزشتہ سے پیوستہ

نئے خزانے

ڈاکٹر وقار اشدی

معارف قرآن

ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا	قرآن مجید، تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۶۴
اشرف علی تھانوی، مولانا	تفسیر بیان قرآن	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۵۵
برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر	منہاج القرآن	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۷۵
ثاقب اکبر	احترام قرآن اور اقبال	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۶، ص ۲۴
جلال الدین حسین بن احمد بخاری	قرآن مجید کے فرائض	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۳۹
حبیب اللہ اوج	قرآن فہمی	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۶، ص ۴
حضرت مجدد الف ثانی	قرآن مجید، مکتوب شست و ہفتم (مکتوبات امام بانی)	تفکر، لاہور مارچ ۹۶، ص ۴۷
حضرت علیؓ	اسلام اور قرآن مع ترجمہ	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۳۵
سید سلیمان ندوی علامہ	تفسیر مولانا احمد علی لاہوری	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۵۷
سید شبیر بخاری، علامہ	کمزور و مظلوم قوموں پر انعامِ الٰہی قرآن کی روشنی میں	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۳۱
سید شبیر بخاری، علامہ	قصص القرآن ایک مطالعہ	تفکر، لاہور، قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۹۵
سید شبیر بخاری، علامہ	مولانا فضل محمد (فقیر والی) اور عشقِ قران	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۱۲۲
عبدالحق حقانی مولانا	ملائکہ اور جن بحوالہ قرآن	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۵۳
عبدالماجد دریا بادی	الکتاب، قرآن مجید کا پہلا تعارف	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۶۵
غلام احمد پرویز	تفسیر قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۸۱
غلام جیلانی برق، ڈاکٹر	دو قرآن	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۷۷
محمد رفیع الدین، ڈاکٹر	علم قرآن تاحیات جاری	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۸۰
نثار احمد فاروقی پروفیسر	قرآن کریم ایک اجمالی تعارف	ضیاء وجیہ، رام پور، جون ۹۵، ص ۸
نعیم الرحمٰن، پروفیسر	قاموسِ تلمیحات --- ساتویں قسط	اردو، کراچی جنوری، جون ۹۴، ص ۶۵

علوم اسلامیہ

ابوالحسن علی ندوی مولانا	عہد عتیق کے صحیفے	تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶، ص ۶۶

ابوسلمان شاہجہانپوری — مولانا عبدالحمید سواتی اور خاندان امام ولی اللہ دہلوی — نعرۃ العلوم، گوجرانوالہ، مارچ ۹۶ء، ص ۳۲
اسرار احمد، ڈاکٹر — اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام — تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶ء، ص ۹۳
امین احسن اصلاحی — اسلامی تاریخ کا ایک باب — تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶ء، ص ۹۰
حسن خان میرانی — بہاول پور کے دو جلیل القدر علما — الزبیر، بہاولپور، ۹۶/۲، ص ۳۸
حمید اللہ ڈاکٹر — حدیث کی عظمت — جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ ۹۷ء، ص ۴۶۹
خورشید احمد — حضور اکرم کی کامل زندگی کا بہترین نمونہ — انشا، کلکتہ مارچ اپریل ۹۶ء، ص ۶
صوفی عبدالحمید سواتی، علامہ — حکمت صوم، فلسفہ ولی اللہی کی روشنی میں — نعرۃ العلوم، گوجرانوالہ فروری ۹۶ء، ص ۲۱
فیاض خان سواتی — امام اعظم ابوحنیفہ عزم و استقلال کا کوہ ہمالہ — نعرۃ العلوم، گوجرانوالہ دسمبر ۹۵ء، ص ۱۹
مشیر الحق — علم کلام اور شریعت کی نئی تعبیر — المعارف، لاہور جولائی ستمبر ۹۵ء، ص ۱۹
مفتی محبوب علی وجہی — درس حدیث — ضیاء وجیہ، رام پور جولائی ۹۵ء، ص ۱۰
مفتی محبوب علی وجہی — درس حدیث — ضیاء وجیہ، رام پور جون ۹۵ء، ص ۱۶
نذیر احمد ڈپٹی — ہندوستان میں خصف اسلام کا ایک سبب — تفکر، لاہور قرآن نمبر مارچ ۹۶ء، ص ۵۹
نعیم صدیقی — شان عثمانؓ بن عفانؓ — تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۶ء، ص ۸
نواب جان قزلباش — حضرت حافظ شاہ جمال اللہ اور ان کی علمی و دینی خدمات — ضیاء وجیہ، رام پور جون جولائی ۹۵ء، ص ۱۸

مطالعہ پاکستان

ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا — اقبال اور پاکستان — تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۶ء، ص ۵
ارشد حسین — غازی کی ان کہی کہانی، پاک بھارت جنگ ۷۱ء کے حوالے سے — سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء، ص ۳۵
س م رضوی — عظیم مسلمان سائنسداں عمر خیام نیشاپوری — تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۶ء، ص ۳۳
خورشید احمد گیلانی — پاکستان اور ملی تقاضے — تسخیر، لاہور اپریل ۹۶ء، ص ۳
شکیل خاں — سائنس اور سائنسی ادب — تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۶ء، ص ۳۸
عبدالکافی ادیب — پشتو شاعری میں وطن کی خوشبو — ادبیات، اسلام آباد ۹۵/۳۴۳۱، ص ۸۳
عبدالحمید قریشی — مولانا شوکت علی — تہذیب، کراچی مارچ ۹۶ء، ص ۹
قدرت اللہ شہاب — ادیب اور آزادی تحریر — اردو نامہ، لاہور فروری ۹۶ء، ص ۱۸
محمد سعید، حکیم — الکندی، وہ پہلا مسلمان سائنسداں جس نے موسیقی کو فنی اور سائنسی حیثیت دی — تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۶ء، ص ۲۶
محمد عارف، ڈاکٹر — طلوع آزادی — اردو نامہ، لاہور فروری ۹۶ء، ص ۲۲
محمد عارف، ڈاکٹر — طلوع آزادی — اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۶ء، ص ۱۸
محمد عارف، ڈاکٹر — طلوع آزادی — اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۶ء، ص ۲۹
مظفر مرزا، پروفیسر — ظہور پاکستان — اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۶ء، ص ۲۵

دکن تاریخ، علم و ادب

امین راحت چغتائی	داغ حیدر آباد میں	مجلہ عثمانیہ، کراچی اپریل جون ۹۶ء ص ۲۴
ایم اے رؤف	جامعہ عثمانیہ کے موسیقار	مجلہ عثمانیہ، کراچی اپریل جون ۹۶ء ص ۱۳۵
عبدالستار خان، پروفیسر	محدث دکن حضرت علامہ عبداللہ شاہ	مجلہ عثمانیہ، کراچی اپریل جون ۹۶ء ص ۱۱
عطاءاللہ خان	مجلہ عثمانیہ کی ابتدا	مجلہ عثمانیہ، کراچی اپریل جون ۹۶ء ص ۱۳
محمد علی کوثر، ڈاکٹر	غوثی ارکانی، دکن کا ایک قادر الکلام سخنور	مجلہ عثمانیہ، کراچی اپریل جون ۹۶ء ص ۱۵

مطالعہ سائنس

امین خان	اسلام اور سائنس	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۸۰
حفیظ الرحمن صدیقی	حیات کی ابتدا	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۲۲
رضی الدین خان	محمد علی شاہ سے انٹرویو اپنے فن سرجری کا واحد سرجن	سائنس ڈائجسٹ، کراچی اپریل ۹۶ء ص ۱۶
شاہد عمران فیض	عالمی توانائی کے بارے میں کچھ انکشافات	سائنس ڈائجسٹ، کراچی اپریل ۹۶ء ص ۳۱
عاطف علی	ڈجیٹل الیکٹرونکس قسط نمبر ۳	سائنس ڈائجسٹ، کراچی اپریل ۹۶ء ص ۱۸۲
عاطف علی	ڈجیٹل الیکٹرونکس قسط نمبر ۲	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۷۵
عامر سعید، ڈاکٹر	گیزر سائنس کی روشنی میں	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۴۴
علی ظفر خان آفریدی	سائنس مذہب کے آئینے میں	تہذیب الاخلاق، کراچی فروری ۹۶ء ص ۴۶
علیم احمد	جہانِ سائنس	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۴۶
علیم احمد	سوچنے دیکھنے سونگھنے اور باتیں کرنے والے ذہین ربوٹ کی پیدائش	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۶
لطف الرحمن خان	مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۶ء ص ۱۴
بشیر الحق	دنیا کی عظیم ترین دوربین	سائنس ڈائجسٹ، کراچی اپریل ۹۶ء ص ۱۰۷
محبوب سبحانی	عالم اسلام اور ایٹمی ٹیکنالوجی	تسخیر، لاہور فروری ۹۶ء ص ۳۲
محمد اسحاق اختر ڈاکٹر	نامیاتی کیمیا، اردو میں رسم بندی اور اصطلاحات	سائنس ڈائجسٹ، کراچی اپریل ۹۶ء ص ۱۳۸
واحد حسین	سپر کمپیوٹر، حال اور مستقبل میں	سائنس ڈائجسٹ، کراچی جنوری فروری ۹۶ء ص ۱۹۰

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت	صفحات
(۱) نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	۲۰۰/-	۴۰۰
(۲) غالب کا سائنسی شعور	ڈاکٹر سید حامد علی شاہ	۷۵/-	۱۵۲
(۳) انتخاب کلامِ ناسخ	رشید حسن خاں	۱۲۰/-	۳۳۰
(۴) ہماری زبان، مباحث و مسائل	پروفیسر طاہر فاروقی	۷۵/-	۱۶۰
(۵) اقبال اور ان کا پیغام	پروفیسر رالف رسل	۱۰/-	۲۴
(۶) غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-	۳۸۳
(۷) رباعیاتِ عجائبات	امّو جان ولی دہلوی	۵۰/-	۸۰
(۸) اقوال و امثال	سید یوسف بخاری	۴۵۰/-	۱۰۰۸
(۹) جدید اُردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	۱۷۵/-	۴۶۴
(۱۰) زبانِ واحد	میرین مولٹینو اصفیہ صدیقی	۱۰۰/-	۱۸۴
(۱۱) مشاہیر یونان و روما (حصہ پنجم)	پلوٹارک/سید ہاشمی فرید آبادی	۱۱۰/-	۲۷۰
(۱۲) اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۵۰/-	۴۴۸
(۱۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر	شفیع عقیل	۹۰/-	۳۱۲
(۱۴) عالمی ادب سے خوبصورت نظموں کے ترجمے	ضمیر احمد	۱۵۰/-	۲۳۰
(۱۵) اُردو پاکستان کی قومی زبان	میاں بشیر احمد	۵۰/-	۹۶
(۱۶) مطالعۂ عبدالحق	سید قدرت نقوی	۱۰۰/-	۱۷۶
(۱۷) آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۵۰/-	۲۸۸
(۱۸) سعید کی پراسرار زندگی	انتظار حسین	۱۲۰/-	۲۲۹
(۱۹) اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۵۰/-	۵۴۴
(۲۰) سر سید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اُردو مولوی عبدالحق	۷۵/-	۱۶۰
(۲۱) خطوطِ عبدالحق بنام آل احمد سرور	پروفیسر آل احمد سرور	۶۰/-	۱۰۴

Regd M. No. 270

Phone: 461406

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

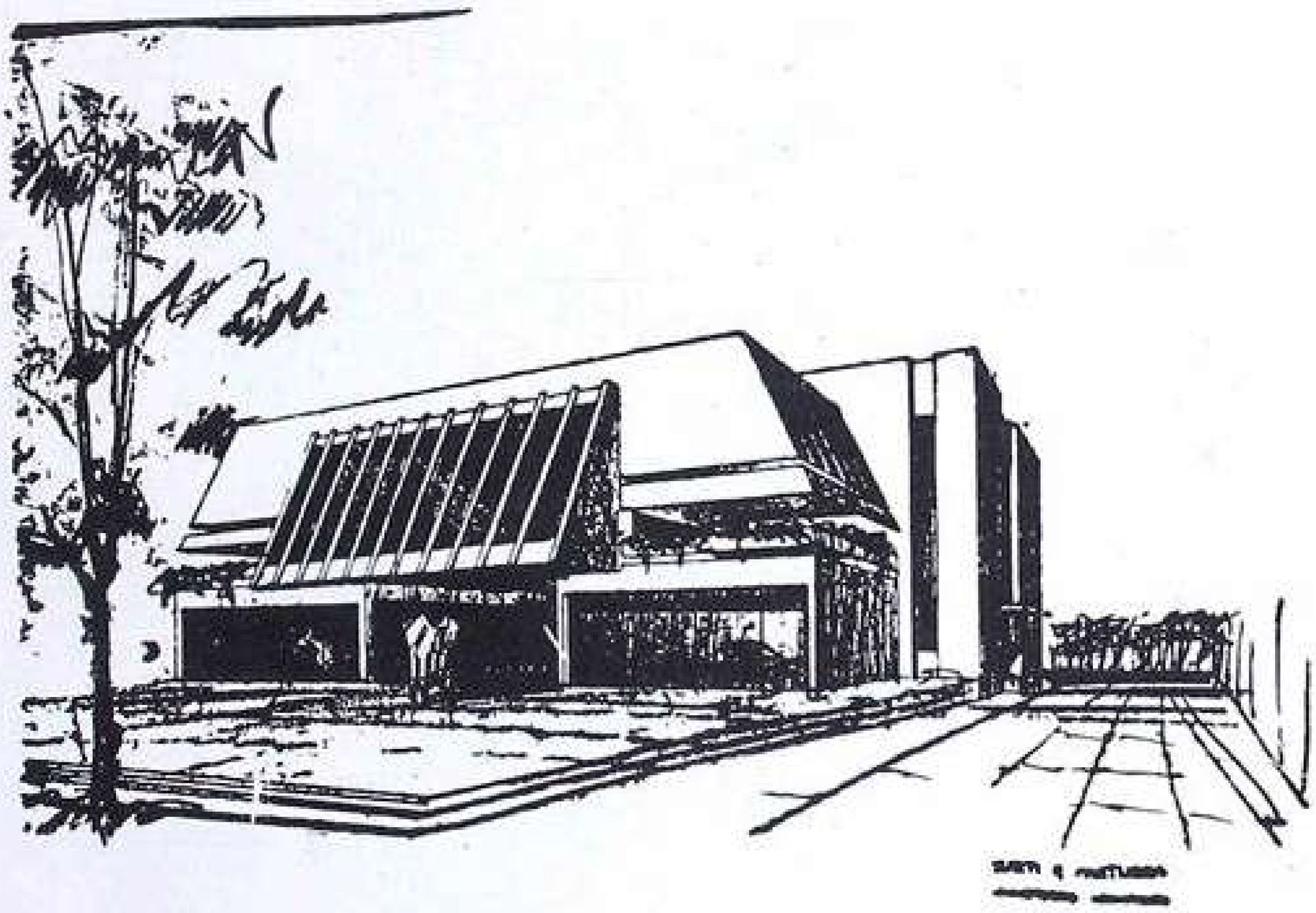

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی